الصحیح

من سیرۃ النبی الاعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد اول

(اردو ترجمہ)

مؤلف

علامہ جعفر مرتضیٰ عاملی

ناشر

معارف اسلام پبلشرز

معارفِ اسلام پبلشرز

نام کتاب	:	الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم (ص) (اردو ترجمہ)
جلد	:	اوّل
مؤلف	:	علامہ جعفر مرتضٰی عاملی
ناشر	:	معارفِ اسلام پبلشرز
تاریخ اشاعت	:	جمادی الاولی ۱۴۲۰ ھ ۔ ق
تعداد	:	دوہزار

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

مقدمہ ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت اور زندگی کے متعلق آج تک مختلف زبانوں میں سینکڑوں کتب اور مقالہ جات مشرقی و مغربی، مسلم و غیر مسلم مورخین کے ذہن کے دریچوں سے نقل کر رشحات قلم کے ذریعے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو کر تحریری روپ دھار چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے خاتم الانبیاءؐ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن و واضح کرنے میں اپنی حد تک موثر کردار ادا کیا ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان میں سامنے آنے والے نکتہ ہائے نظر، پس پردہ اغراض و مقاصد، ان میں پنہاں محرکات اور مورد استفادہ قرار پانے والے منابع میں نہ صرف تفاوت بلکہ تناقض و تضاد پایا جاتا ہے۔

صدر اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کی سیرت اور زندگی صرف آپؐ کے اصحاب کے مشاہدات اور مسموعات میں ہی منحصر تھی۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد نئی نسل میں احادیث کا علم اور آپؐ کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور حوادث کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شدید شوق اور تشنگی پیدا ہوئی، لیکن اصحاب اور تابعین کی یکے بعد دیگرے اموات اور خلیفہ دوم کی جانب سے پیغمبر اکرمؐ کی احادیث اور تاریخ قلمبند کرنے پر پابندی عائد کئے جانے سے آپؐ کی زندگی کے بارے میں صحیح معلومات تک رسائی مشکل، بلکہ اس میں مختلف قسم کی رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں۔ یوں مسلمان آنحضرتؐ کی روشن و درخشاں اور نشیب و فراز سے معمور زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے محروم ہو گئے۔ اسی دوران بعض مورخین نے کسی تجزیہ و تحلیل کے بغیر اور غیر منصفانہ طور پر تاریخی واقعات نقل کیے، جبکہ بعض دوسرے مورخین نے پہلے سے گھڑے غلط مفروضات، حدسیات اور غیر مستند اجتہاد کے بل بوتے پر بعض کتب تالیف کیں، لیکن دور اندیش، باریک بین، متعہد، ذمہ دار اور محقق مورخین نے بچے کھچے مدارک سے استناد کرتے ہوئے نہ صرف عہد پیغمبر اکرمؐ میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات اور حوادث کے بارے میں درست تجزیہ و تحلیل کیا، بلکہ صحیح اور غیر صحیح و من گھڑت تاریخ میں تفریق کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کے میدان میں نیا انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے، اس طرح مسلمانوں کے ہاں موجود "سیرت نویسی" کی روش میں بہت بڑی تبدیلی نے جنم لیا، جو بعد میں سنگ میل ثابت ہوئی۔

جدید دور میں محققانہ تاریخ نویسی نے نئی شکل اختیار کی اور محققین اور مورخین نے عہد پیغمبر اسلامؐ میں جنم لینے والے واقعات اور حوادث کو پہلے سے زیادہ بحث و تمحیص اور تنقیدی نگاہ سے مورد توجہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ محقق جناب سید جعفر مرتضیٰ عاملی نے گراں بہا کتاب " الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم " تالیف کر کے زندگی پیغمبر اسلامؐ کی صحیح و مستند تاریخ پیش کرنے کی جانب ایک بڑا قدم اٹھایا ہے۔ تحقیق و جستجو کے لحاظ سے تاریخ اسلام کے دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے محققین کے لیے یہ بہترین نمونہ عمل ہے۔

یہ کتاب جو انتہائی آسان فہم الفاظ و مطالب اور سلیس و روان عبارت اور مکمل محققانہ انداز میں تالیف کی گئی ہے، پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو واضح طور پر پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ محترم مؤلف نے تاریخی واقعات کو صرف نقل کرنے پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ موشکافی اور انتہائی وقت کے ساتھ بہت سارے تاریخی واقعات کو پردہ ابہام سے باہر نکالا اور قارئین کے اذہان میں تاریخ کے متعلق روش تحقیق کی ایک نئی طرح متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ ایک جدید روش کی داغ بیل ڈالی ہے۔

اس کتاب کو اردو میں ڈھالنے کا مقصد یہ ہے کہ " اردو زبان مسلمان " پیغمبر اکرمؐ کی صحیح تاریخ تک کہ جو انتہائی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے، رسائی حاصل کرتے ہوئے اپنے باعث افتخار اور درخشاں ماضی کو خوف و امید سے آمیختہ مستقبل کے لیے مشعل راہ قرار دیں۔ وہ مستقبل جو دنیا کے دور دراز علاقوں میں مسلمانوں کی بیداری کی وجہ سے بغض و عداوت اور کینہ کا شکار ہو چکا ہے، وہ مستقبل جسے دشمنان اسلام و مسلمین مختلف سازشوں کے ذریعے درخشاں و تابناک ماضی سے جدا کر کے اس میں تحریف ایجاد کرنے اور اسے نابود کرنے کے درپے ہیں۔

اس کتاب کا اردو میں ترجمہ " معارف اسلام پبلشرز " کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ ادارہ حوزہ علمیہ قم کی مشہور علمی شخصیت، فقیہ عالیقدر جناب آیت اللہ طاہری خرم آبادی (دامت برکاتہ) کے زیر سرپرستی اسلامی علوم و معارف کی ترویج کے لیے کام کر رہا ہے۔ تاریخ اسلام کے حقائق کے متلاشی افراد بالخصوص جوانوں کو اس گراں قدر کتاب کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی اسلامی خودی کی طرف لوٹیں اور اسلام کے عظیم اور نورانی تمدن سے استفادہ کرتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ کی سیرت سے الہام لیتے ہوئے اپنے لیے ایک واضح راستے کا انتخاب کریں اور اسی پر اپنا طرز زندگی استوار کریں۔

من اللہ التوفیق

" معارف اسلام پبلشرز "

ضروری وضاحتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

و الحمد للّٰہ رب العالمین. الرحمان الرحیم.
مالک یوم الدین. ایاک نعبد و ایاک نستعین.
اھدنا الصراط المستقیم .....
و الصلاۃ و السلام علی محمد المصطفی، خاتم
الانبیاء و المرسلین و آلہ الکرام البررۃ، الطیبین الطاھرین.
و اللعنۃ علی اعدائھم اجمعین، من الاولین،
و الاخرین، الی یوم الدین.

قبل اس کے کہ میں اس کتاب "الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم" کے مطالب قارئین کی خدمت میں پیش کروں، مندرجہ ذیل امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

۱۔ موجودہ کتاب کی تدوین کے سلسلے میں پہلے درجے پر میں نے سابقین کی کتب پر تکیہ کیا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں معاصرین کی کتب کی طرف کوئی قابل ذکر رجوع نہیں کیا، کیونکہ ان کتابوں میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ عام طور پر ایسے مطالب ہیں جو انہوں نے گذشتہ افراد کی کتابوں سے لئے ہیں البتہ ان مطالب کو انہوں نے خاص نظم و ترتیب، مختلف انداز نگارش کے ساتھ اور توجیہ و اصلاح کے ساتھ تالیف کیا ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کام کیا ہے کہ ان مطالب پر اپنی تائید و تاکید کے ساتھ جملات اور کلمات کو نئی ترتیب اور نئے رنگ میں پیش کر کے اپنی علمی برتری کو ان مطالب کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بغیر اس کے کہ انہوں نے اس حوالے سے کوئی تحقیق کی ہو اور ان کے صحیح یا غلط ہونے میں دقت نظر سے کام لیا ہو۔ گویا انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ نصوص، وحی الٰہی کا جزء ہیں اور ان میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اگرچہ وہ آپس میں متضاد اور متصادم ہی کیوں نہ ہوں اور انہوں نے ہر طریقے سے انہیں جمع اور ان کی تصحیح کرنے کی سعی کی ہے اور اگر ان کا آپس میں جمع کرنا ممکن نہ ہوسکا تو پھر انہوں نے سوچا کہ ان پر سکوت اختیار کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ہمیں حقیقت حال سمجھ میں نہیں آئی۔

۲۔ اس کتاب میں میری زیادہ کوشش یہی رہی ہے کہ اس چیز کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں جس کا تاریخ کے عنوان سے ادعا کیا گیا ہے، تحقیق اور جستجو کروں لیکن اس حد تک کہ جتنی اس کتاب کے حدود اجازت دے سکیں۔ اس طرح میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ وقت کے ان لمحات کی اچھائی اور برائی کی مکمل تصویر کشی کی جائے اور جو واقعات حساس موارد سے لبریز ہیں خصوصاً ایسے مواقع جو ہمیشہ محققوں، سیاستدانوں اور مذہبی افراد کی توجہ کا مرکز رہے ہیں اور وہ اپنے اہداف کی تکمیل کے لئے ہمیشہ ان واقعات کو بطور شاہد پیش کرتے رہے ہیں کیونکہ ایسے ہی واقعات اور لمحات تھے جنہوں نے انسانی معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیا اور انسانیت کے معیاروں پر کاری ضرب لگائی گئی یہ صرف ظاہر اور سطحی اقدامات نہ تھے۔

ہر چند یہ کام حقیقت میں انتہائی دشوار اور مشکل ہے لیکن مجھے اچھی طرح علم ہے کہ

عالم اسلام کے کتب خانوں کو ایسی جدوجہد کی کتنی ضرورت ہے اگرچہ یہ کتنی محدود اور نامکمل ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے میں اس میدان میں داخل ہونے کیلئے آمادہ ہوگیا اور مشکلات کو برداشت کرنے پر تیار ہوگیا تاکہ میری یہ کوشش اس زمانے کے واقعات اور حوادث کی شناخت کے لئے "علمی تحقیق" کے طریقہ کار پر اعتماد کی طرف پہلا قدم قرار پائے۔

۲۔ اگر کسی وقت قاری، کتاب کی تحقیقات اور تجزیہ و تحلیل میں نشیب و فراز کا مشاہدہ کرے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایک لمبے عرصے کے دوران لکھی گئی ہے طویل مدت، انسان کے راستے میں وقت کے عنصر سے کما حقہ استفادہ کرنے میں رکاوٹ ہے۔ اسی طرح انسان کی مختلف حالتیں مثلاً کبھی وہ تازہ دم ہے، کبھی اسے تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی مسرور اور شاداں ہوتا ہے، کبھی وہ غمگین ہوتا ہے، بحث اور تحقیق کی مشکلات کو حل کرنے میں اثر انداز ہوتی ہیں اور انداز گفتگو پر ان کا اچھا خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔

۳۔ اسلامی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ سیاسی اور مذہبی اغراض اور دوسرے عوامل کی وجہ سے جھوٹ اور کذب سے مخلوط ہو چکی ہے جس کی وجہ سے حقیقت تک پہنچنا نہایت دشوار اور انتہائی مشکل ہے۔ اگرچہ ناممکن نہیں ہے. بہرحال ضروری ہے کہ درج ذیل امور کی روشنی میں تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔

الف) ایک خاص قسم کی تالیفات اور مخصوص مولفین کے نظریات پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کی وجہ سے انسان بہت سے حقائق کے جاننے سے محروم ہو جاتا ہے جو تاریخ کے گوشہ و کنار میں واقع ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے حقائق جو ضخیم پردوں کو بھی پارہ پارہ کر دیں تاکہ وہ ہم تک صحیح و سالم پہنچ جائیں اور تحریف سے محفوظ رہیں۔ پیشہ ور سیاستدان اور متعصب افراد ان پنہاں حقائق سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے اور اپنے لئے نقصان دہ نہیں سمجھتے تھے لہذا انہوں نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا لیکن با بصیرت محققین اور حق کے متلاشیوں نے جو تعصب کی آلودگی سے پاک تھے اور دھوکے باز افراد کی پست خصلت اور تحریف کی لعنت سے دور تھے جن کی تعداد بہت ہی کم ہے، تحقیق کے دامن کو تھام لیا

اور حقائق تک پہنچ گئے۔

اس امر کی دلیل یہ ہے کہ کبھی ایک شخص کسی چیز کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور حد سے زیادہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن اس پر اسے کوئی واضح اور درست ثبوت نہیں مل پاتا اور وہ سرگردان رہتا ہے لیکن بناوٹی باتوں اور خیالی دنیا سے دور، بعض ضرورت مند افراد اس تک پہنچ جاتے ہیں ایسے افراد کوشش کرتے ہیں کہ انسانی زندگی کی فکری جہتوں کو تبدیل کر کے انسان کو ہر ئے امر سے بے نیاز کر دیں۔

ب) ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسناد کی بحث اور ان پر اعتماد کرنا اس عنوان سے کہ وہ اس موضوع کو قبول کرنے کا تنہا معیار اور مقیاس قرار پائیں یعنی ہم صرف نصوص کے چند موارد پر اکتفا کر لیں یہ بات ہمارے اہداف کو پورا نہیں کرتی کیونکہ یہ امر پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کا خلاصہ پیش کرنے سے بھی قاصر ہے چہ جائیکہ صدر اسلام کی تاریخ کے مجمل پہلوؤں کو اجاگر کر سکے۔

اس صورت میں بہت سی صحیح روایات جو صرف صحت سندی کے معیار پر پورا نہیں اترتیں اور ان میں قبولیت کی کمترین شرائط کا بھی فقدان ہو ان سے ہمیں ہاتھ کھینچنا پڑے گا۔ ایسے موقع پر ایک محقق جہاں آزادی حرکت، واقعات کو آپس میں ربط دینے اور نتائج اخذ کرنے کی قدرت سے محروم ہو جائے وہاں وہ اپنے عمیق فہم و ادراک سے جو اسے مسلسل تجربات کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے، ان حقائق کو کشف کرنے میں کوئی مدد نہیں لے سکے گا جن کی اسے تلاش تھی اور یوں حقائق ابہام میں رہ جائیں گے۔

یہ سب مسائل ان اہم مشکلات کے علاوہ ہیں جو ہمیں گفتگو کو ارباب فکر و دانش تک پہنچانے اور بحث کو ان کے لئے مقبول اور معقول انداز میں بیان کرنے کے حوالے سے پیش آتی ہیں اور ان کے حل کے بغیر ہمارے پاس کوئی چارہ کار بھی نہیں ہوتا۔ خصوصاً یہاں پر جس بنیادی مشکل کا سامنا ہے وہ اسناد کو قبول اور رد کرنے کے معیاروں سے مربوط ہے اور اس امر سے متعلق ہے جو عام طور پر بنیادی عقائد کی اساس پر استوار ہوتا ہے۔ لیکن خود ان امور میں بحث ایک لمبی مدت اور بہت زیادہ جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ البتہ یہ بات

اس وقت درست ہے جب ہم بہت سے موارد میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں اور ہماری گفتگو بے فائدہ اور مجمل رہ جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ فکر و شناخت کے منابع اور اعتقاد کی بہت سی بنیادوں کے بارے میں مختلف مذاہب اور علماء کے درمیان ہمیشہ اختلاف رہا ہے لہذا جب ہم سند کے بارے میں بحث کریں گے تو ہمارا انداز اور روش وہ ہوگی جس پر سب فرقوں کا اتفاق ہوگا یا کم از کم وہ اکثریت کے نزدیک قابل قبول ہوگی۔ اگرچہ اکثر مواقع پر ایک گروہ دوسرے گروہ سے نتیجہ نکالنے کی کیفیت میں مختلف ہوتا ہے۔

ج) گذشتہ امور کے علاوہ نصوص، تاریخی ثبوت اور روایات کو پرکھنے اور ان کے باہمی ارتباط کو سمجھنے کے لئے جس نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے وہ مبادیٔ اسلام و قرآن اور نبی الاعظم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی شخصیت، روحانیت اور اخلاق ہے۔ بلکہ ہمیں ہر اس شخصیت کے بارے میں یہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے جس کی مجموعی سیرت، اخلاق اور نظریات کے بارے میں ہمیں علم ہوتا ہے۔

د) ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ بحث و گفتگو کے ایسے اور بہت سے ذرائع موجود ہیں جو مسلسل تجربات کے مرہون منت ہوتے ہیں مثلاً نصوص کا تناقض اور یہ کہ یہ تناقض ایک وقت کی ایسی شخصیت کے احوال سے سامنے آتا ہے جو اس وقت عموماً زندہ ہی نہیں ہوتی یا تاریخی حسابات لگانے اور تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا اس زمانے میں وقوع پذیر ہونا ممکن ہی نہیں تھا اور اس طرح کے دوسرے امور جنہیں ہم بہت جلد بیان کریں گے۔

۵۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ کی تدوین اور نگارش کو جس قدر اہمیت دی اس کی مثال سابقہ امتوں میں نہیں ملتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان تمام نقائص کے باوجود تاریخ اسلام بطور مطلق ایک غنی اور مالامال تاریخ ہے۔ لیکن چونکہ اس کی تدوین میں سیاسی نظریات اور مذہبی تعصبات اور دیگر عوامل کا عمل دخل رہا ہے جن کی وجہ سے تاریخ اسلام جھوٹی اور بناوٹی باتوں سے مخلوط ہوگئی ہے اور اس کے حجم میں اضافہ ہوگیا ہے۔ (جیساکہ پہلے بھی ہم نے کہا ہے) لہذا طبیعی طور پر روایات اور واقعات میں سے صحیح

کو باطل سے جدا کرنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ نا ممکن بھی ہے اسی لئے جہاں تک ممکن تھا ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی حیات طیبّہ اور اس زمانے کے واقعات کی ایک عموی و اجمالی تصویر کشی کی ہے اور اسی پر اکتفا کیا ہے۔

۶۔ جیساکہ قارئین محترم ملاحظہ کریں گے کہ ہم نے مصادر اور شواہد سے کم از کم مقدار میں استفادہ کیا ہے اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ جن حقائق کو ہم نے عام طریقے سے پیش کیا ہے ان کی تائید اور تاکید کے لئے بہت زیادہ مصادر اور منابع کو فراہم کیا جا سکتا تھا۔

۷۔ جہاں ہم نے دوسروں کے مطالب اور نکات سے استفادہ کیا ہے وہاں ہم نے حوالے کا ذکر کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ البتہ جہاں کوئی حوالہ یا مآخذ نہیں ملا وہاں ہم نے کسی کے قول پر اعتماد نہیں کیا۔

۸۔ آخر میں اس بات کا اظہار کرتا چلوں کہ جن اوقات میں راقم کے فکری حالات سازگار اور ہشاش بشاش تھے ان مواقع پر بعض بحث سے مربوط حاشیے اور ملاحظات صفحہ تحریر پر درج ہوگئے لیکن جب کبھی ذہنی آمادگی اور پیشگی مطالعہ نہیں تھا اور ارتجالاً بات لکھی گئی ہے اس صورت میں ایک مکمل اور جامع گفتگو نہیں ہوسکی۔ البتہ اس کے باوجود اس کی کم از کم خصوصیت یہ ہے کہ قاری اور راقم دونوں کے لئے ایک تنوع ایجاد کرتی ہے۔

ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اب یہ قاری کی مرضی ہے کہ وہ فیصلہ اپنی حس کی بنیاد پر کرے یا مطالب کی وسعت اور گہرائی کی اساس پر کرے۔

آخر میں مجھے امید ہے کہ صاحبان فکر و نظر اور ارباب قلم مجھے اپنی آراء سے آگاہ فرمائیں گے اور تشکر یہ کا موقع فراہم کریں گے۔

و الحمد للّٰہ و صلاتہ علی عبادہ الذین اصطفی محمدّ و آلہ الطاہرین.

جعفر مرتضی الحسینی العاملی

قم المقدسہ، ایران

۱۶ ذی الحجہ ۱۴۰۰ ہجری

پیش لفظ (۱)

ماضی کا حال سے رشتہ اور نگارش تاریخ:

یہ بات بدیہی ہے کہ انسانی معاشروں کی زندگی ایک دوسرے سے جدا اور امتیازی واقعات پر مشتمل نہیں ہے۔ یوں نہیں ہے کہ ایک واقعے کا دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق اور واسطہ نہ ہو اور ان میں سے مختلف اوقات کا آپس میں کوئی ارتباط اور اتصال ہی نہ ہو۔ بلکہ زمان ماضی اپنی تمام تر کوششوں اور اپنے تمام نتائج اور ثمرات کو زمان حال کے دامن میں ڈال دیتا ہے تاکہ وہ اپنی حرکت و قوت کے عناصر اور اپنے وسائل کمال کو ایک مستقل اور مطمئن راہ پر لگا سکے اور پھر انہیں اپنے بلند اہداف کے حصول میں بروئے کار لائے۔

اسی طرح یہ بات بھی روشن اور عیاں ہے کہ بعض تاریخی واقعات ایسے ہیں جنہیں اگرچہ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن انکے اثرات ہماری زندگیوں پر ابھی تک موجود ہیں۔

۱۔ یہ مقدمہ درحقیقت ہماری کتاب "حیات الامام الرضا السیاسیۃ" کے مقدمہ کا خلاصہ ہے چونکہ یہ ہماری بحث سے مربوط تھا اس لئے ہم نے اسے یہاں نقل کر دیا ہے تاکہ اس کتاب کی طرف رجوع کرنا ضروری نہ رہے۔

اسی طرح ان واقعات کا امت کی تشکیل، اس کی حیات، مختلف امور بلکہ اس کے مفاہیم اور جذبات و احساسات پر بہت بڑا اثر ہوا ہے تا چہ رسد کہ دین و ادب، علم و سیاست اور اقتصاد و اجتماعی روابط وغیرہ پر ان کے اثرات مرتب نہ ہوئے ہوں۔ البتہ واقعات کے اثرات ایک امت سے دوسری امت تک کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک گروہ سے دوسرے گروہ تک۔

تاریخ کاسب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ دیانتداری اور باریک بینی کے ساتھ گذشتہ امت کی زندگی، اس کے اوضاع و احوال، اس کی فکری اور اقتصادی بنیادوں، سیاسی نظریات، اجتماعی روابط اور دیگر موارد کی صحیح عکاسی کرے اور ہم سے بیان کرے۔

یہاں سے تاریخ کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور امتوں کی زندگیوں میں اس کے اثرات سے ہم آگاہ ہوتے ہیں اسی طرح ہم پر یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مختلف امتوں نے کیوں اس قدر تاریخ کی تدوین، تدریس اور تجزیہ و تحلیل کو اہمیت دی ہے۔ یہ اہتمام صرف اس لئے تھا کہ ہم اس ذریعے سے گذشتہ لوگوں کے اطوار زندگی اور تجربات کو جان لیں اور اپنے مستقبل کے لئے ان سے استفادہ کریں۔

اس کا ایک اور مقصد یہ بھی ہے کہ ہم ان کے عروج اور زوال کے عوامل کو سمجھیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے سالم اور استوار بنیادیں رکھیں۔

کیا ہماری بھی کوئی تاریخ ہے؟

ہم ایک امت ہیں لیکن ہماری کوئی تاریخ نہیں ہے (اس سے ہماری مراد کتب تاریخ ہیں) ایسی تاریخ جس سے ہم آج کے پیچیدہ دور میں بہت زیادہ استفادہ کرسکیں۔ کیونکہ اس حوالے سے جتنی بھی کتب موجود ہیں وہ یا تو تنگ نظری کی بنیاد پر یا مذہبی مفادات کے زیر اثر یا پھر سلاطین کی خوشنودی اور حاکمیت کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ "تنگ نظری" سے ہماری مراد کسی واقعے کو اس کے اسباب اور علل کو نظر انداز کرتے ہوئے اخذ کرنا ہے۔

یہ امر درست ہے کہ اس وقت جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے اس میں اکثر بادشاہوں اور حکمرانوں کی تاریخ ہے۔ لیکن وہ بھی مسخ اور تحریف شدہ ہے اور اس میں سلاطین اور حکام کی حقیقی زندگی کی عکاسی کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔ کیونکہ مورخ نے وہی بات تحریر کی ہے جو حاکم کی خواہشات کے مطابق تھی ہر چند وہ حقیقت کے خلاف اور خود مورخ کے نظریئے اور اہداف کے برعکس ہی کیوں نہ تھی۔

اس بناء پر کوئی عجیب بات نہیں لگتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مورخ گھٹیا اور فضول قسم کے امور کو زیر بحث لاتا ہے اور مجلس شراب، ساقی اور پینے پلانے کی بات کرتا ہے یا وہ ایسے واقعات اور شخصیات کو تراشتا ہے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا اور اس کے مقابلے میں تاریخی کردار اور اثرات کے حامل واقعات اور شخصیات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ان کا ذکر ہی نہیں کرتا۔

اسی طرح وہ خود حاکم وقت یا اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے افعال اور اعمال کو تحریف کر کے نقل کرتا ہے جن کی وجہ سے امت کی اجتماعی زندگی پر موجودہ وقت میں یا مستقبل میں عظیم اور اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں اس ابہام، چشم پوشی اور حقائق کو کتمان کرنے کا کوئی بھی سبب اور غرض ہو سکتی ہے۔

تاریخ کا تجزیہ:

گذشتہ مطلب کی روشنی یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاریخ کی کتابوں سے استفادہ اور ان کا مطالعہ کرنے والے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہایت احتیاط، باریک بینی اور مکمل بصیرت کے ساتھ ان کا مطالعہ کرے اور ہر ہر لفظ کو غور سے پڑھے۔ جہاں تک ممکن ہو ایک واقعہ کا دوسرے واقعے سے موازنہ کرے ان کا آپس میں تقابلی جائزہ لے اور جہاں بھی اسے تحریف کا شائبہ ہو یا ذاتی رجحانات اور خواہشات کا عمل دخل نظر آئے، اسے نظر انداز کر دے یا پھر اس نکتہ پر توقف اختیار کرے۔ البتہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے خصوصاً اس

حصے میں کہ جو صدر اسلام کی تاریخ سے مربوط ہے۔ تاریخ اسلام کا غالباً یہی حصہ متعصب اور تقلیدی افکار کے ذریعے بلکہ بیشتر تو یہ لوگ خود ہی ظالم تھے، مدوّن ہوا ہے۔

ہمارا طریقہ کار:

ہماری یہ کوشش ہوگی کہ ہم اپنی تاریخ کا روشن اور صاف ستھرا رخ پیش کریں جس کی ابتداء آغاز اسلام سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہم اپنی کوششوں کو ان روایات اور نصوص جنہیں تاریخ بنا کر پیش کیا گیا ہے، میں سے صحیح کو باطل سے جدا کرنے پر مرکوز کریں گے درحقیقت یہ وہی خیالات اور اوہام ہیں جنہیں افسانہ نگاروں، قصہ سازوں، ہوا پرستوں اور مطلب پرستوں نے اختراع کیا ہے۔

اہم حقیقت:

یہاں پر ایک انتہائی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرنا نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ یہی مدون تاریخ اسلام اپنے نقائص کے باوجود بطور مطلق ایک امت کی غنی ترین تاریخ ہے اور دوسری تمام تواریخ سے دقیق ہونے اور اپنی وسعت کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ جب آپ اس تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس میں واقعات، جملات اور مواقف کے علاوہ حرکات و سکنات، توجہات اور چہرے کے تاثرات تک کا ذکر موجود ہے ان سب چیزوں کو نہایت دقیق اور بے نظیر انداز میں ثبت کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں صحیح احادیث اور روایات سے اس قدر زیادہ مطالب حاصل ہوجاتے ہیں جس کی مثال کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس نکتہ پر ہم تاکید کرتے ہیں کہ افراد اور شخصیات کی تمام گفتگو کا قطعی اور یقینی طور پر ریکارڈ ہونا باقی کسی تاریخ میں ممکن نہیں ہے خصوصاً بہت سے اہم واقعات میں چہ جائیکہ جزئی امور میں ایسا ہو جائے۔

تاریخ اسلام کی ایک اور خصوصیت جو اسے دیگر تواریخ سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس کے اندر ایسے قواعد اور راستے موجود ہیں جن کی وجہ سے ایک محقق اطمینان کامل اور لغزش سے بے خطر ہو کر حقیقت کو پا سکتا ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ ان قواعد اور اصولوں کی پابندی کرے جن کی طرف ہم کتاب کے مقدمے میں اشارہ کریں گے۔

اس لحاظ سے کہ تاریخ اسلام کا نقطہ آغاز سید المرسلین حضرت محمدؐ کی سیرت ہے لہذا ہم بھی اسی سے ابتداء کرتے ہیں۔ اس باب میں ہم گفتگو کے اہم اور اساسی خدوخال کو محققین اور دانشوروں کی کوششوں کے لئے بعنوان مقدمہ پیش کریں گے، اس کے بعد دوسرے مطالب کو بیان کریں گے۔ یہاں پر اب ہم اپنی کتاب "حدیث الافک" کے شروع میں ذکر شدہ نامکمل مقدمے کو مکمل کرتے ہیں۔ نیز عنوان گفتگو کی مناسبت سے مزید مفید نکات کا اضافہ کر کے بیان کریں گے۔ اس کے بعد حضرت ختمی المرتبتؐ کی سیرت کے بارے میں گفتگو کا آغاز کریں گے۔

تمہید

صفات النبیؐ:

بے شک ہر نبی روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے اور نبیوں کے سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر اس خلافت کا کون حقدار ہو سکتا ہے۔ آپؐ اعلیٰ و اشرف انسان اور فضل و کمال، عقل و جمال، حکمت و دانش، عزت و وقار، جاہ و جلال کا نمونہ تھے۔ آپؐ علم و حکمت کے مظہر، اسوہ شجاعت اور پیکر تقویٰ تھے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آپؐ کی ذات اقدس تمام اعلیٰ انسانی کمالات اور فضیلتوں کا مجموعہ تھی اور ہر لحاظ سے انسان کامل تھے۔ آپؐ ایسے انسان تھے جن کے چھوٹے سے چھوٹے عمل میں کوئی خلل اور کمزوری دکھائی نہیں دیتی اور رفتار و گفتار میں تضاد، تناقض اور پراگندگی کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک جملے میں کہا جائے کہ آپؐ ایک معصوم اور ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے مبرا اور منزہ انسان تھے۔ اس عالم کی تمام مخلوقات سے افضل اور اکمل تھے۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قیامت تک کے بنی نوع انسان کے لئے نمونہ عمل قرار دیا ہے، آپ کی اطاعت کو ان پر واجب قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ جزئی ترین اعمال میں بھی آپؐ کی پیروی کو فرض کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ". (سورہ احزاب / ۲۱)

یعنی رسولؐ تمہارے لئے کامل نمونہ ہیں۔

دین اور امت سے غداری

لیکن جب ہم ایسی روایات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ کے عنوان سے بطور سند پیش کی جاتی ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نبیؐ جسے قرآن "علی خلق عظیم" (۱) کے الفاظ سے یاد کرتا ہو، جو تمام انبیاء اور مرسلین کا سردار اور ان سے اشرف و افضل ہو، جو کائنات میں کامل ترین انسان ہو، جو عقل کل، مدبر کل اور امام کل ہو۔ وہ ایک عاجز اور متناقض شخص نظر آتا ہے۔ وہ بچگانہ حرکتیں کرتا ہے جاہلوں کی طرح گفتگو کرتا ہے، اس کی رضایت اور خوشنودی اسی طرح اس کا غم و غصہ کسی ضابطے کے تحت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے غصے کے ہاتھوں عاجز ہے۔ آخر میں یہ روایات اس کا تعارف یوں کراتی ہیں کہ وہ ایک شخص ہے جو مشکلات اور مسائل کو حل کرنے کے لئے ہر وقت تربیت اور تعلیم کا محتاج ہے گویا باقی سب اس سے دانا تر اور قوی تر ہیں۔

اس روایت کی کس طرح اور کس بیان سے تفسیر کی جائے جو یہ بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی زوجہ کو حبشیوں کے کرتب یوں دکھائے کہ انھوں نے اپنا رخسار اپنی زوجہ کے رخساروں پر رکھا ہوا تھا علاوہ ازیں انھیں اپنے کندھوں پر بھی سوار کیا؟

یا ایک اور روایت کہتی ہے کہ آپؐ لشکر کو چھوڑ کر الگ ہوگئے اور اپنی بیوی کے ساتھ صحرا کے وسط میں دوڑ لگانے لگے وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ کئی بار؟ یا یہ کہا گیا ہے کہ جب آپؐ نے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو جذباتی حالت میں دیکھا تو آپؐ اس کے دلباختہ ہوگئے؟ اسی طرح کی اور بہت سی روایات آپؐ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں جعل کی گئی ہیں جنھیں بیان کرنا ہمارے لئے معیوب ہے اور مناسب نہیں ہے جب ہم ان کے بیان کرنے سے قاصر ہیں تو آپؐ نے انھیں انجام کیسے دیا ہوگا؟

۱۔ اگرچہ بعض علماء نے یہ احتمال دیا ہے کہ "خلق" سے مراد دین یا عادت اور سنت عظیمہ ہو لیکن یہ بات اس عبارت کے ظاہری معنی کے خلاف ہے۔

اسی طرح یہ بات کیسے تسلیم کرلیں کہ کسی ایک مسئلے میں پیغمبر اکرمؐ ایک رائے دیں بعد میں آیت نازل ہو اور آپؐ کی رائے کو غلط قرار دے جبکہ دوسروں کی رائے کو درست قرار دے، اس سے غم زدہ ہو کر پیغمبر اکرمؐ بیٹھ کر رونا شروع کر دیں؟ یا آپؐ کے کسی قوم کے گندگی کے ڈھیر کے پاس سے گزرنے اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی کیسے تاویل کی جائے؟ اسی طرح اس جھوٹ کی کیا توجیہ کی جائے کہ ایک شیطان ہے جو آپؐ کے پاس جبرئیلؑ کی شکل میں آتا ہے اور اللہ تعالیٰ آپؐ کی مدد کرتا ہے تاکہ شیطان اسلام لے آئے۔ یا یہ کہ آپؐ نے شراب نوش فرمائی۔ اس بات کو کس طرح بیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں آپؐ حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ شک و تردید میں مبتلا تھے؟

اسی طرح کی اور بہت سے گھٹیا ترین باتیں جو آنحضرتؐ کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ حدیث اور تاریخ کی کتب ایسی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔

ہاں! ایسی روایات جو کائنات کے افضل ترین انسان اور تمام انبیاء اور رسولوں کے سردار کا اس انداز سے تعارف کراتی ہیں۔ ان میں سے اکثر روایات حدیث کی ایسی کتب میں موجود ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ قرآن کے بعد معتبر ترین کتب ہیں۔

ان روایات کی طرف رجوع کرنے والا شخص حضور اکرمؐ کے متعلق یہ تصور قائم کرتا ہے اگر اس کا ذہن تاریخ کے حقیقی معیاروں اور بنیادوں سے خالی ہو جو کہ تاریخ میں تحقیق کا لازمہ ہے اسی طرح اگر یہ شخص اس عظیم شخصیت کی خصوصیات سے آگاہ نہ ہو جو زمین پر اللہ کا خلیفہ اور اس کے ارادے کا مظہر ہے یا اس کا باطن روایات کی اندھی تقلید اور خواہ مخواہ کے تقدس سے پاک نہ ہو کیونکہ یہ احترام اور تقدس کبھی کبھار روایات کو ہر قسم کے نقائص سے مبرا قرار دے دیتا ہے اور احادیث کی صحیح و سالم اور حقیقی اہمیت معلوم کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس تقدس کا سبب کیا ہے؟ جبکہ ابھی یہ ثابت ہی نہیں ہوا کہ یہ کلام آنحضرتؐ سے صادر ہوا ہے یا نہیں؟ اسی طرح آیا یہ آنحضرتؐ کے افعال اور اوصاف سے مربوط ہے یا آپؐ سے غلط منسوب کیا گیا ہے؟

حضور اکرمؐ کی ایسی تصویر پیش کرنا تاریخ، امت اور پوری انسانیت کے ساتھ ایک بہت بڑی خیانت ہے۔ اس کے غم میں ہمیشہ ہم خون کے آنسو روتے رہیں گے۔

خطرناک سازش

بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب افتراء اور تحقیر آنحضرتؐ کی ذات اقدس پر کیوں لگائی گئی ہیں؟ ہماری رائے میں یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا ہے جس کا مقصد درحقیقت اسلام کو صفحہ ہستی سے محو کرنا تھا جس کے ابتدائی مرحلے کے طور پر، پیغمبر اکرمؐ کی شخصیت کو نشانہ بنایا گیا اور اس الٰہی رسولؐ کی شخصیت کو غیر موثر اور داغدار بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس سازش کے اصلی محرک اور بانی اموی حکام اور ان کے حواری تھے جو حضور اکرمؐ کے ساتھ انتہائی بغض رکھتے تھے۔ یہاں پر ہم بنی امیہ کی اس سیاسی چال کے چند نمونے ذکر کرتے ہیں جن میں بلا واسطہ نبی اکرمؐ کی ذات اور اسلام کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

۱۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زید بن علیؑ نے کہا ہے کہ میں ہشام بن عبدالملک کے پاس موجود تھا، اس کے سامنے پیغمبر اکرمؐ کو گالیاں دی گئیں لیکن ہشام نے نہ تو اس شخص کو روکا اور نہ ان باتوں کی تردید کی۔ (۱)

۲۔ خالد بن سلمہ المخزومی جو "الفافا" کے نام سے معروف ہے، کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ وہ مرجی (۲) اور علیؑ کا دشمن تھا وہ ہمیشہ بنی مروان کے سامنے ایسے

۱۔ اربلی نے اپنی کتاب کشف الغمہ، ج۲ ص ۳۵۲ میں دلائل الحمیری سے نقل کیا ہے اور قاموس الرجال ج۴ ص ۲۷۰ میں موجود ہے۔

۲۔ مرجی کبھی ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کا لغوی معنی "وہ شخص ہے

اشعار پڑھتا تھا جن میں رسول اللہؐ کی بدگوئی اور ہجو کرتا تھا۔ اس صورت حال کے باوجود بخاری کے علاوہ باقی تمام صحاح ستہ کے مصنف اس سے روایت نقل کرتے ہیں۔ (۱)

۲۔ اسی طرح عمرو عاص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایک عیسائی کو سزا دینے پر راضی نہیں تھا جس نے آنحضرتؐ کو دشنام دیں تھیں۔ (۲)

۳۔ ایک انصاری اور ایک اموی آپس میں فخر و مباہات کر رہے تھے۔ اموی اپنے بزرگان کا تذکرہ کرنے لگا کہ جب رسول اللہؐ کی رحلت ہوئی تو وہ آپ کے عمال تھے۔

جو کام کو تاخیر میں ڈالتا ہے" اصطلاح میں مسلمانوں کے اس فرقے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو بھی جرم کی سزا نہ دی جائے بلکہ اسے آخرت پر موقوف کر دیا جائے۔ بعض کے نزدیک مرجئہ انہیں کہا جاتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایمان کے ہوتے ہوئے بڑے سے بڑا گناہ بھی کوئی ضرر نہیں پہنچاتا جس طرح کفر کی حالت میں اطاعت اور نیک عمل کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا اور انہیں اس لئے مرجئہ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے نظریے کے مطابق گناہوں کی سزا اور عذاب، آخرت تک مؤخر ہے۔ ان کے بارے میں بھی آراء پائی جاتی ہیں مثلاً جبریوں کو بھی مرجئہ کہا جاتا ہے وغیرہ۔

(مترجم)

۱۔ "بحوث مع اہل السنۃ و السلفیۃ" ص ۱۰۱ اور مرحوم مظفر کی کتاب "دلائل الصدق" ج۱ ص ۲۹ کی طرف رجوع کریں، اس مقام پر علامہ محمد رضا مظفر مرحوم نے ایک حاشیہ لکھا ہے جو بہت مفید ہے۔

۲۔ الاستیعاب (الاصابۃ پر حاشیہ) ج۳ ص ۱۹۳ اور الاصابۃ ج۳ ص ۱۹۵ جو کہ بخاری سے روایت کرتے ہیں اور اپنی تاریخ میں صحیح سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

انصاری اس کے جواب میں کہتا ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اسلام کو نابود کرنے کے لئے انہوں نے مرتدین سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ اموی یہ دندان شکن جواب سن کر خاموش ہوگیا۔ (۱)

۵۔ جب مشہور شاعر "کمیت" رسول اللہؐ کی مدحت میں شعر کہتا ہے تو کچھ لوگوں پر ناگوار گزرتا ہے اور وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ تو کمیت یہ شعر پڑھتا ہے:

الی السراج المنیر احمد لا
یعدلنی عنہ رغبۃ و لا رھب

عنہ الی غیرہ و لو رفع الناس
الی العیون و ارتقبوا

و قیل: افرطت، بل قصدت و لو
عنفنی القائلون، او ثلبوا

الیک یا خیر من تضمنت الارض
و ان عاب قولی العیب

لج بتفضیلک اللسان و لو
اکثر فیک الضجاج و اللجب

۔ میں نے سراج و منیر احمدؐ کی طرف رخ کیا ہے، مجھے تو کوئی لالچ اور کوئی خوف ایسا کرنے سے نہیں روک سکتا

۔ اگرچہ لوگوں کی نظریں میری طرف اٹھ رہی ہوں اور وہ میری تاڑ میں ہوں

۔ تیرے بارے میں کہا گیا ہے کہ میں نے افراط سے کام لیا ہے لیکن میں نے معمول کی حد سے بھی کم تر بات کی ہے

۱۔ ربیع الابرار للزمخشری ج۱ ص ۴۰۸ و ۴۰۹

ـ اگرچہ لوگ مجھے مورد عتاب قرار دیں لیکن میرا کلام حقیر ہدیہ ہے تیری بارگاہ میں اے زمین پر رہنے والے خیرالبشر

ـ اگرچہ نکتہ چین افراد نے میرے کلام کو عیب سمجھا ہے لیکن میری زبان خود بخود تیری فضیلت میں رواں ہے

شاید "کمیت" نے محسوس کر لیا تھا کہ اس اعتراض کے پیچھے کوئی بڑی سازش کار فرما ہے اس لئے وہ یوں کہنے پر مجبور ہوا۔

رضوا بخلاف المهتدين و فيهم

مخباة اخرى تصان و تحجب

ـ وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ ہدایت یافتہ افراد کے مخالف راستے کو اختیار کریں شاید پردے کے پیچھے کوئی راز ہے جسے وہ چھپانا اور محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

البتہ یہاں پر جس چیز کی وہ پردہ پوشی کر رہے ہیں اس سے مراد خلیفہ کو رسول اللہؐ سے افضل سمجھنا نہیں ہے کیونکہ یہ بات کسی پر پوشیدہ نہ تھی جیساکہ بنی امیہ کے نمائندوں مثلاً خالد قسری اور حجاج بن یوسف نے اس بات کی صراحت کی تھی لہذا جس بات کو وہ مخفی رکھنا چاہتے تھے وہ وہی اسلام کو مٹانا تھا اور رسول خداؐ کی شخصیت کو کمزور اور مسخ کرنا تھا۔ (۱) اس کی تفصیل سے آپ آئندہ آگاہ ہوں گے۔

۶ـ مطرف بن مغیرہ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی سلطنت اور حکومت کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ وہ دنیا سے چلے گئے تو ان کی یاد بھی محو ہوگئی یہ سب گفتگو کرنے کے بعد معاویہ نے مغیرہ سے کہا لیکن بنی ہاشم سے تعلق

۱ـ اس بارے میں کتاب "بحوث مع اہل السنة و السلفية" کے ص ۱۰۱ اور ۱۰۲ پر رجوع کیا جائے۔

رکھنے والے شخص (مراد پیغمبر اکرمؐ کی ذات ہیں) کا ہر روز پانچ مرتبہ ادب و احترام کے ساتھ یوں نام لیا جاتا ہے "اشهد ان محمدا رسول الله"، پس اے مغیرہ تیری ماں مرجائے۔ اس صورتحال میں ہمارا کونسا حربہ کامیاب رہا... نہیں! خدا کی قسم یہ نام بھی دفن ہونا چاہیے۔ (۱)

اس بارے میں کہا گیا ہے کہ سن ۲۱۲ ہجری میں صرف معاویہ کی اسی بات کی وجہ سے خلیفہ مامون، معاویہ پر لعنت کرنے لگا۔ البتہ اگر بعد میں اس کام سے انصراف پر قانع نہ ہوا ہوتا تو۔ (۲)

۷۔ جب عبداللہ بن زبیر نے مکہ اور حجاز پر تسلط حاصل کر لیا تو عبدالملک بن مروان نے لوگوں کو حج پر جانے سے منع کر دیا جب لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو اس نے جامع مسجد اقصی اور صخرہ پر گنبد بنا کر لوگوں کے دل جیتنے کی کوشش کی اور اس حیلے سے عوام کو حج سے روکنا چاہا۔ لوگ صخرہ کے سامنے توقف کرتے تھے، خانہ کعبہ کے طواف کی طرح اس کا طواف کرتے تھے۔ وہ عید قربان کے دن وہاں قربانی کرتے تھے اور اپنے سروں کو منڈواتے تھے۔ (۳)

اس کے بعد جیسا کہ "جاحظ" نے تصریح کی ہے، انھوں نے قبلہ ہی بدل دیا ظاہرا انھوں نے اپنا قبلہ خانہ کعبہ کی بجائے بیت المقدس میں یہودیوں کے قبلہ صخرہ کو قرار دیا۔ جیسا کہ گذشتہ مطالب اس پر دلالت کرتے ہیں۔

۱۔ الموفقیات ص ۵۷۷، معتزلی کی شرح نہج البلاغۃ ج۵ ص ۱۲۹ و ۱۳۰ اور مروج الذھب ج۳ ص ۳۵۴ اور قاموس الرجال ج۹ ص ۲۰

۲۔ مروج الذھب ج۳ ص ۳۵۴ و ۳۵۵

۳۔ البدایۃ و النہایۃ ج۸ ص ۲۸۱-۲۸۰ اور ان کتب کی طرف رجوع کیا جائے: تاریخ یعقوبی ج۲ ص ۱۶۱، مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ ج۱ ص ۱۲۹، دمیری کی حیات الحیوان ج۱ ص ۱۶۶ اور السنۃ قبل التدوین ص ۵۰۶-۵۰۲۔

جاحظ کہتا ہے کہ "یہاں تک کہ عبدالملک بن مروان، اس کا بیٹا ولید ان دونوں کا عامل حجاج اور ان کا مددگار یزید بن ابی مسلم وہاں پر قابض ہوئے تو انہوں نے خانہ کعبہ کو گرا دیا۔ مسجد النبیؐ پر حملے کو جائز سمجھا، خانہ کعبہ کو گرادیا، اس کی حرمت کو پامال کیا اور شہر واسط کے قبلہ کو تبدیل کردیا..."۔

اور وہ اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ فرض کریں کہ قبلہ کو تبدیل کرنے کی بات غلط ہو اور خانہ کعبہ کی ڈھانے کی بھی تاویل کی جاسکتی ہو، اس طرح ان کے اس نظریے کی بھی توجیہہ کی جا سکتی ہو کہ "خاندان میں کسی شخص کا جانشین اور خلیفہ اس کے پیغمبر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے"۔ (۱) اس بات کو بہت سے ذرائع نے نقل کیا ہے۔

وہ مزید لکھتا ہے کہ "ہاشم فخر کرتا ہے کہ ہم نے کعبہ کو نہیں ڈھایا، قبلہ کو تبدیل نہیں کیا اور رسولؐ کو خلیفہ سے کم تر نہیں سمجھا"۔ (۲)

اس امر کی درستی کی دلیل یہ ہے کہ شہر واسط کے قاضی اسد بن عمرو نے دیکھا کہ شہر کا قبلہ ٹیڑھا ہے اس نے اسے سیدھا کر دیا۔ اس کے بعد اس پر رافضی (۳) ہونے کا الزام لگایا گیا۔ (۴)

۱۔ رسائل جاحظ ج۲ ص ۱۶

۲۔ آثار جاحظ ص ۲۰۵

۳۔ رافضہ مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے، جو اصحاب کی آراء یعنی ابوبکر، عمر کی بیعت کو قبول نہیں کرتا اور رسول اللہ (ص) کے بعد امامت اور خلافت کا حقدار حضرت علیؑ کو سمجھتا ہے۔ اس لئے انہیں رافضہ کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

۴۔ نشوار المحاضرات ج۶ ص ۳۶ اور تاریخ بغداد ج۷ ص ۱۶

حجاج نے شہر واسط کی بنیاد رکھی تھی ظاہر یہ ہے کہ ابتداء میں اس کا قبلہ درست تھا لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا گیا۔

شاید اسی وجہ سے فقط اہل عراق (کوفہ، بصرہ وغیرہ) کے لئے تھوڑا سا بائیں طرف رخ کر کے نماز پڑھنا مستحب ہے اور مقصد یہ ہے کہ ان کا کعبہ کی طرف رخ بہتر ہو جائے۔ آئمہ علیہم السلام نے چپکے سے یہ بات لوگوں کے کانوں میں ڈال دی لیکن جب ان سے اس حکم کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے بات کو ٹال دیا۔ (۱) لیکن پھر بھی شیعوں کے دشمن اس بات کی طرف متوجہ ہوگئے، اس لئے جس نے بھی قبلے کو درست کرنے کی بات کی اور اقدام کیا اس پر رافضی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۸۔ کتاب "اخبار الملوک" میں احمد بن ابی طاہر روایت کرتا ہے کہ "جب معاویہ نے سنا کہ موذن "اشهد ان محمدا رسول الله" کہہ رہا ہے تو کہنے لگا آفرین ہے تیرے باپ پر اے عبداللہ کے بیٹے، بڑی بلند ہمت تھی تمہاری، تم اپنے لئے اس سے کم تر پر راضی نہ ہوئے کہ تمہارا نام بھی رب العالمین کے ساتھ آئے۔ (۲)

۹۔ سلمہ بن کہیل نقل کرتا ہے کہ میرے اور ذرالمرهبی (جو کہ کوفہ کے عبادت گذار اور صحاح ستہ کے راویوں میں سے تھے) کے درمیان حجاج کے کفر اور ایمان کے بارے میں اختلاف ہوگیا۔ میں اسے کافر کہتا تھا اور وہ اسے مومن سمجھتا تھا۔ حاکم نے کہا حجاج کے کفر پر دلیل وہ بات ہے "مجاہد بن جبیرہ نے ابوسہل اور احمدالقطان اور اس نے اعمش سے اس کے بارے میں بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "واللہ" میں نے حجاج بن یوسف سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس ھذیل شخص (مراد عبداللہ بن مسعود) پر حیران ہوں کہ وہ گمان کرتا ہے یہ جو قرآن وہ پڑھتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا کی قسم!

۱۔ وسائل، ابواب قبلۃ فی الصلاۃ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ معتزلی کی شرح نہج البلاغۃ ج۱۰ ص ۱۰۱ کی طرف رجوع کریں۔

قرآن عربوں کے رجز کے علاوہ کچھ نہیں ہے خدا کی قسم! اگر میں اس ھذیل شخص کو پالیتا تو اس کی گردن توڑ دیتا۔ اور ابن عساکر اور بعض دیگر علماء مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حجاج نے کہا "اگر میرے بس میں ہوتا تو قرآن کو ابن مسعود کی قرائت سے خالی کر دیتا اگرچہ یہ کام خنزیر کے دانتوں کے ذریعے ہی کرتا یا خنزیر کے دانتوں کے ذریعے اسے قرآن سے اکھیڑ دیتا۔ (۱)

ابن کثیر نے اس کلام کو بہت ہی برا اور قبیح شمار کیا ہے۔ جو شخص اس مسئلہ کے بارے میں زیادہ وضاحت چاہتا ہے وہ اس کی کتاب "البدایۃ و النہایۃ" کی طرف رجوع کرے۔

۱۰۔ الف: جاحظ نے کہا ہے کہ حجاج نے کوفہ میں اپنے خطبے میں ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا جو مدینہ میں آنحضرتؐ کی قبر کی زیارت کرنے کے لئے جاتے تھے، کہ برباد ہوں وہ لوگ جو لکڑی اور بوسیدہ ہڈیوں کا طواف کرتے ہیں۔ وہ کیوں امیر المومنین عبدالملک کے محل کے گرد چکر نہیں لگاتے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ انسان کا خلیفہ اور جانشین اس کے رسول (پیغام پہنچانے والے) سے افضل ہوتا ہے؟

مبرد نے اس بارے میں کہا ہے کہ "اسی وجہ سے فقہاء نے حجاج کے کافر ہونے کا فتوی دیا ہے اور حجاج نے یہ بکواس اس وقت کی جب لوگ طواف کرنے میں مشغول تھے۔ بہرحال یہ واقعہ مشہور اور معروف ہے۔ (۲)

۱۔ مستدرک الحاکم ج۳ ص ۶۵۶ اس کا خلاصہ جو ذہبی نے کیا ہے اور اسی صفحہ پر حاشیہ، تاریخ ابن عساکر ج۴ ص ۶۹ الغدیر ج۱۰ ص ۱۵ (مستدرک الحاکم اور تاریخ ابن عساکر کے حوالے سے) البدایۃ و النہایۃ ج۹ ص ۱۲۸ ابوداؤد اور ابن ابی خیثمۃ سے نقل کیا ہے۔

۲۔ اس مسئلے میں محمد بن عقیل کی کتاب النصایح الکافیۃ ص ۸۱ (جو کہ جاحظ سے نقل کرتے ہیں)، مبرد کی الکامل ج۱ ص ۲۲۲ معتزلی کی شرح نہج

ب: بلکہ حجاج نے عبدالملک کو لکھا کہ "انسان کا جانشین خاندان میں اس کے رسول اور قاصد سے افضل ہوتا ہے، یا امیر المومنین! اسی طرح سے خلفاء انبیاء اور مرسلین سے افضل ہیں"۔ (۱)

ج: خالد بن عبداللہ قسری کہتا ہے کہ جب اس نے نبی اکرمؐ کا نام لیا تو حجاج نے پوچھا کہ کیا انسان کی طرف سے کسی کام کے حوالے سے بھیجا جانے والا شخص افضل ہے یا اس کا جانشین اپنے خاندان سے افضل ہے؟ یہ بات پوچھ کر وہ یہ اظہار کرنا چاہتا تھا کہ ہشام نبی اکرمؐ سے افضل ہے۔ (۲)

د: عصر حاضر میں وہابیت بنی امیہ کی سیاست کی مروج ہے۔ اس نے بھی وہی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا قائد محمد بن عبدالوہاب آنحضرتؐ کے بارے میں کہتا ہے کہ "وہ تو ایک قاصد تھا" اس کے بعض شاگرد اس کی موجودگی میں یا غیر موجودگی میں یہ باتیں کرتے تھے اور وہ ان پر رضایت کا اظہار کرتا۔ وہ کہتا تھا کہ "میرا عصا محمد (ص) سے بہتر ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ سے سانپ اور دوسرے موذی حیوانات کو مارا جا سکتا ہے لیکن محمد (ص) مردہ ہوگیا اور وہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، وہ تو صرف ایک ڈاکیہ تھا"۔ (۳)

۱۱۔ خالد قسری نے مکہ مکرمہ میں بعض تابعین کو حضرمی خاندان کے گھروں میں محبوس کر دیا۔ عوام پر یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے اس کی سرزنش کی تو اس نے نماز

البلاغۃ ج۱۵ ص ۲۴۲ البدایۃ و النہایۃ ج۹ ص ۱۳۱ اور سنن ابی داؤد ج۴ ص ۲۰۹ کی طرف رجوع کریں۔

۱۔ العقد الفرید ج۲ ص ۳۵۴

۲۔ الاغانی جلد ۱۹ صفحہ ۶۰

۳۔ کشف الارتیاب ص ۱۳۹ نے خلاصۃ الکلام ص ۲۳۰ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

کے خطبے میں لوگوں سے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ چونکہ میں نے امیر المومنین کے دشمنوں اور اس سے جنگ کرنے والوں کو گرفتار کیا ہے تو تم میری سرزنش کر رہے ہو۔ خدا کی قسم! اگر وہ حکم دے کہ کعبہ کو گرا دو تو میں کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ مجھے قسم ہے اپنے پروردگار کی کہ خدا کے نزدیک امیر المومنین انبیاء (ع) سے زیادہ عزت والا ہے۔ (۱)

مدائنی بھی یہی کہتا ہے کہ خالد نے کہا اگر امیر المومنین کا حکم ہو تو خانہ کعبہ کو ملیامیٹ کر دوں اور اس کے پتھروں کو شام پہنچا دوں۔ (۲)

۱۲۔ ابوعبیدہ بیان کرتا ہے کہ ایک دن خالد قسری خطبہ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "جب ابراہیم خلیل اللہ نے اللہ تعالیٰ سے پانی کی درخواست کی تو خدا نے انھیں کھارے اور کڑوے پانی سے سیراب کیا لیکن جب امیرالمومنین نے پانی مانگا تو اللہ تعالیٰ نے اسے میٹھے اور ٹھنڈے پانی سے نوازا"۔ (۳)

خالد قسری نے ایک دن اپنے عامل ابن ابی سے پوچھا کہ ہمارا کنواں بہتر ہے یا زمزم؟ اس نے جواب دیا "اے امیر، کون بدبخت ہے جو ٹھنڈے اور شیریں پانی کو کڑوے اور کھارے پانی جیسا سمجھے" خالد نے زمزم کا نام ام جعلان (۴) رکھ دیا تھا۔ (۵)

۱۳۔ عبدالرزاق ثوری سے، وہ مغیرہ سے اور مغیرہ اپنے باپ سے روایت نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا "میں نے حجاج کو دیکھا وہ مقام ابراہیمؑ پر پاؤں رکھنا چاہتا تھا لیکن ابن حنفیہ

۱۔ الاغانی ج۱۹ ص ۶۰

۲۔ الاغانی ج۱۹ ص ۵۹

۳۔ جعلان، جعل کی جمع ہے۔ یہ سیاہ کیڑا ہے جسے سیاہ بھونرا کہتے ہیں۔

۴۔ الاغانی ج ۱۹ ص ۶۰

۵۔ الاغانی ج ۱۹ ص ۵۹

آڑے آ گیا اور اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ (۱)

۱۴۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر حجاج کی گھٹیا ترین اور خبیث ترین حرکت یہ ہے کہ اس نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان میں بہت بڑی گستاخی کی اور وہ یہ ہے کہ اس نے ابن زبیر کے خلاف جنگ کے دوران خانہ کعبہ پر منجنیق کے ذریعے پتھر پھینکنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ انسانی فضلہ بھی خانہ کعبہ پر پھینکا، (نعوذ باللہ) خدا کی اس پر لعنت ہو۔ (۲)

۱۵۔ ایک دن ولید بن یزید (لعنہ اللہ) نے یہ آیت پڑھی: "و استفتحوا و خاب کل جبار عنید من ورائھم جھنم....." (سورہ ابراہیم / ۱۵) یعنی انہوں نے فتح کی خواہش کی اور اس سے ہر جبار اور سرکش ناامید ہوا اور اس کے پیچھے جہنم ہے"۔

اس کے بعد اس نے تیر کے ذریعے قرآن کو پھینک دیا اور یہ شعر کہے:

تہددنی بجبار عنید
فہا انا ذاک جبار عنید

اذا ما جئت ربک یوم حشر
فقل یارب خرقنی الولید (۳)

۔ مجھے سرکش کہتے ہو اور مجھے ڈراتے ہو لو میں ہوں متکبر اور سرکش

۔ جب حشر کا دن آئے تو اپنے رب سے کہہ دینا کہ اے پروردگار! مجھے ولید نے پارہ پارہ کر دیا تھا

۱۔ حافظ عبدالرزاق کی کتاب ج۵ ص۴۹ ، طبقات ابن سعد ج۵ ص۸۴ اور والقضیۃ فی ربیع الابرار ج۱ ص۸۴۳ اس میں آیا ہے کہ ابن حنیفہ نے کہا: "خدا کی قسم میرا مصمم ارادہ تھا کہ اگر اس نے مجھے کچھ کیا تو میں اسکی گردن اڑا دیتا"۔

۲۔ عقلاء المجانین ص ۱۸٤ اور ابن اعثم کی المفتوح ج۲ ص ٤٨٦

۳۔ بہج الصباغہ ج۵ ص ۳۳۹، حورالعین ص ۱۹۰، مروج الذھب ج۳ ص ۲۱٦

اسی ولید نے ایک مجوسی سے کہا کہ خانہ کعبہ کے اوپر اس کے لئے ایک میکدہ تعمیر کرے، اسی طرح وہ ہشام کے دور میں مکّہ گیا اور اپنے ساتھ کھیے جتنا ریشمی کپڑے کا خیمہ اور شراب لے کر گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ خیمہ کو کعبہ پر نصب کر کے اس میں بیٹھے لیکن حواریوں نے اسے لوگوں کی شورش سے ڈرایا تو وہ ایسا کرنے سے باز رہا۔ (۱)

۱۶۔ آخری بات یہ ہے کہ بعض افراد نے شافعیوں کے بارے میں کہا ہے کہ تعجب کی بات ہے کہ شافعی کے اگر دو قول ہوں تو ایک قول کے حوالے سے دوسرے قول کی مخالفت کو جائز سمجھتے ہیں لیکن یہ جائز نہیں سمجھتے کہ نص رسول اللہؐ کا سہارا لے کر اس کی مخالفت کریں۔ (۲) اس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی مگر یہ کہ رسول اللہؐ کی شان و منزلت ان کے نزدیک آپ کے حقیقی رتبے سے بہت ہی کم ہے۔ یہ مدعا ان کے ظواہر الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

ابو زھرۃ کہتا ہے کہ "امام مالک کا نظریہ یہ تھا کہ وہ صحابہ کے فتوی کو سنت کا درجہ دیتے تھے۔ جہاں پر تعارض پیش آ جاتا وہ ان کے فتوؤں اور احادیث نبویؐ کو ایک ہی معیار پر پرکھتے تھے۔ وہ آنحضرتؐ کی تمام احادیث کے بارے میں یہی سلوک روا رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہوتیں"۔ (۳)

حدیث رسولؐ اور صحابہ کے فتوی کے مابین متعارضین کا حکم جاری کرنے کی روش جو مالک نے اختیار کی اس کی وجہ سے شوکانی نے ان تمام افراد کو تنقید کا نشانہ بنایا جو اصحاب کے اقوال کو احادیث نبویؐ کے برابر معتبر سمجھتے تھے۔ اگر آپ چاہیں تو اس کے قیمتی کلام

۱۔ بہج الصباغہ ج۵ ص ۲۳۰ (جس میں طبری اور اغانی سے نقل ہوا ہے)۔

۲۔ مجموعۃ الرسائل المنیریۃ ص ۳۲

۳۔ ابوزھرۃ کی کتاب "ابن حنبل" ص ۲۵۱/۲۵۵ اور اس کی کتاب "مالک" ص ۲۹۰

کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ (۱)

یہ ایک وسیع اور طولانی موضوع ہے لیکن ہم اس کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ ان کے نزدیک آنحضرتؐ کی قدر و منزلت، ان کی تعلیمات اور احادیث کی اہمیت کا اجمالی خاکہ آپ کے سامنے آ جائے۔

راز پنہاں:

اسلام کے مقدسات خصوصاً رسول اعظمؐ کی ذات اقدس سے ان کی دشمنی، آپؐ کی کرامات کو نابود کرنے اور آنحضرتؐ کی قدر و منزلت کو گھٹانے کا اصلی سبب کیا ہو سکتا ہے۔ شاید اس کی بازگشت درج ذیل امور کی طرف ہوتی ہے:

۱۔ بنی ہاشم کے ساتھ بنی امیہ کی سیاسی دشمنی، بنی امیہ کی بنی ہاشم کے ساتھ پرانی دشمنی تھی اور نبی بھی اور آنحضرتؐ بھی ہاشمی تھے اور عزت و شرف، مجد و کرامت اور عظمت و بزرگی کی بلندیوں پر فائز تھے۔ یہ امر بالخصوص بنی ہاشم کے لئے بہت بڑا افتخار اور اعزاز تھا۔

۲۔ اس ذریعے سے وہ حکمران طبقے کے برے اعمال، ان کی پلیدیوں اور انحرافات اور برائی کو کم کر کے لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ان حکام کے افعال و کرداراور انسان اول اور نمونہ کامل کی سیرت و کردار میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے اگرچہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے ان کے اعمال رسول گرامیؐ کے کردار کے مساوی نہ تھے۔

۱۔ ابوزہرۃ کی کتاب "ابن حنبل" ص ۲۵۴/۲۵۵ اور شوکانی کی کتاب "ارشاد الفحول" ص ۲۱۴

۳۔ دشمنوں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس دین کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں کیونکہ یہ ان کی خواہشات، اغراض اور شہوات کی راہ میں رکاوٹ تھا اور ان کے مفادات کو ضرر پہنچاتا تھا۔

۴۔ ان میں سے بہت سارے حکمرانوں کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور حقانیت پر کامل ایمان نہ تھا۔ یہ وہ بات ہے جو شرابی اور بندر باز یزید نے اپنے شعر میں صراحت سے کہی ہے۔

لعبت ہاشم بالملک فلا خبر و لا وحی نزل ...

۔ بنی ہاشم نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا نہ کوئی خبر آئی تھی اور نہ ہی کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔

اسی کی پیروی کرتے ہوئے ولید بن یزید نے یہ شعر کہے:

تلعب با الخلافة هاشمی
بلا وحی اتاه و لا کتاب

فقل لله یمنعنی طعامی
و قل لله یمنعنی شرابی (۱)

۔ ہاشمی (یعنی پیغمبر اکرم) نے خلافت کا کھیل کھیلا ہے اس پر نہ کوئی وحی نازل ہوئی نہ کتاب آئی۔

۔ اپنے خدا سے کہو کہ مجھے کھانے اور پینے سے روک لے۔

۱۔ حورالعین ص ۱۹۰، مروج الذهب ج۳ ص ۲۱۶، بهج الصباغة ج۵ ص ۳۳۹ کہ وہ مروج الذهب سے نقل کرتا ہے۔ دوسرا بیت قصیدہ ابوبکر کا اقتباس ہے۔ جیساکہ اس کا ذکر آئندہ بدر و احد کی فصل میں آئے گا۔

شراب کا ذکر کرنے کے بعد اس نے مزید کہا:

فلقد ایقنت انی

غیر مبعوث لنار

ساروض الناس حتی

یرکبوا (ایر...) الحمار

و ذروا من یطلب

الجنۃ یسعی لتبار (۱)

ـ مجھے اطمینان ہے کہ میں جہنم میں نہیں جاؤں گا۔

ـ میں جلدی عوام کو راضی کرلوں گا کہ وہ گدھے (ایر) پر سواری کریں۔

ـ جو بہشت کا طلبگار ہے اسے چھوڑ دو کیونکہ وہ اپنی زندگی کو ضائع کر رہا ہے۔

اس کی تفصیل الگ سے فرصت کا تقاضا کرتی ہے۔

۱ـ حورالعین ص ۱۹۱-۱۹۰

اموی سیاست کے نتائج

گذشتہ سیاست کے اثرات کے ساتھ ساتھ حدیث نبویؐ کی ممنوعیت اور بزرگ اصحاب کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی حدیثیں (جو انھوں نے آنحضرتؐ سے روایت کی تھیں) کو جلانے کی سیاست بھی رائج رہی ہے۔ اس کا آغاز حضرت ابوبکر کے دور میں ہی ہوگیا تھا۔ انھوں نے اپنی جمع شدہ پانچ سو احادیث پیغمبرؐ کو جلا دیا۔ (۱) حضرت عمر کے دور میں اس عمل میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔ حضرت عمر نے شاہد کے بغیر احادیث نبویؐ کو ممنوع کر دیا تھا۔ انھوں نے بزرگ اصحاب کو مدینے میں نظربند کر دیا اور ایسے افراد کو مختلف شہروں میں بھیج دیا جنھیں اسلام اور احکام سے کوئی آگاہی نہیں تھی۔ اس نے حدیث نقل کرنے پر قدغن لگا دی صرف حکومت کے عمال اور طرفداروں کو حدیث نقل کرنے کی اجازت تھی۔ مثال کے طور پر ابوہریرہ، انس، کعب الاحبار اور حضرت عائشہ۔ مروان کہتا ہے کہ "ازواج رسولؐ اور اپنی ماؤں کی موجودگی میں ہم دوسروں سے کس طرح سوال کر سکتے ہیں"؟ (۲) حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں ان تمام احادیث کو جمع کر کے نذر آتش کر دیا جو صحابہ کرام نے حضور اکرمؐ سے سن کر لکھی تھیں۔ (۳) اس بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ "عمر بن خطاب کے دور میں حدیثوں کی بہتات ہوگئی تھی، حضرت عمر نے اعلان کروایا تھا کہ ان سب کو اکٹھا کیا جائے جب ان کی جمع آوری ہو چکی تو ان سب کو جلانے کا حکم انھوں نے

۱۔ نص و اجتہاد ص ۱۵۲-۱۵۱ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ المصنف ج۱ ص ۱۶۶

۳۔ حدیث نبوی (ص) کے نقل کرنے سے ممانعت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ شعبی کہتا ہے: میں نے ابن عمر کے ساتھ دو یا ڈیڑھ سال کا عرصہ گزارا، اس دوران میں نے اس کی زبان سے حضور کی صرف ایک حدیث سنی۔ (سنن الدارمی جلد ۱ صفحہ ۸۴ سنن ابن ماجۃ جلد ۱ صفحہ ۱۵ اور مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۱۵۷

صادر کر دیا اور اس کے بعد کہا یہ مثنات (صحیح تلفظ مشنات) ہیں (۱) جس طرح اہل کتاب کے مثنات ہیں"۔ (۲) یا اس نے کہا" مجھے یاد آیا کہ تم سے پہلے ایک قوم تھی کہ جس نے کتابیں لکھیں اور کتاب الٰہی کو ترک کر کے ان کو اختیار کر لیا۔ خدا کی قسم! میں کتاب خدا کے ساتھ کسی اور چیز کو مخلوط نہیں ہونے دوں گا"۔

بعد میں آنے والوں نے حضرت عمر کی روش کو اپنایا اور اسی کی روش اختیار کرتے ہوئے نقل حدیث کو ممنوع قرار دیا صرف اس حدیث کی اجازت دی گئی جو ان کے دور میں

اس کے الفاظ یہ تھے: "جالست ابن عمر سنتین ما سمعتہ روی شیئاً عن رسول اللّٰہ (ص) " کہ میں دو سال تک ابن عمر کے پاس بیٹھا لیکن اس نے مجھے رسول اللّٰہ (ص) سے نقل کر کے کوئی چیز نہیں سنائی۔ اسی طرح الغدیر ج۱۰ ص ۶۵ کی طرف رجوع کریں جو ان کے حوالے سے بیان کرتی ہے)۔ اسی طرح حضرت ابوذر پر نبی اکرم (ص) کی احادیث کو نقل کرنے کے اصرار اور اس مسئلے میں حکام کی مخالفت کی وجہ سے جو کچھ بیتی' اس سے سب آگاہ ہیں۔ باقی خلفاء کے ادوار میں صرف اسی حدیث کو نقل کرنے کی اجازت تھی جو حضرت عمر کے زمانے میں رائج تھی۔ یہاں تک کہ تمام بڑے بڑے اصحاب دنیا سے چلے گئے اور چھوٹی عمر کے صحابہ اور کاروباری قسم کے اصحاب باقی رہ گئے' جن کے ذریعے سے سادہ لوح عوام کو فریب اور دھوکہ دیا گیا اور ان سادہ لوح افراد کی تعداد کس قدر زیادہ ہے۔ یہ موضوع ایک مستقل اور تفصیلی بحث کا تقاضا کرتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ و اللّٰہ ھو الموفق و الھادی۔

۱۔ مشنات وہ روایات تھیں جنہیں یہودیوں نے تدوین کیا تھا۔ بعد میں انہیں مشنات کا نام دیا گیا جن کی بعد میں علماء یہود نے شرح کی اور انہیں جمارا کہا گیا۔ اس اصل و شرح کے مجموعے کو تلمود کہا جاتا ہے۔

۲۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۴۷ طبقات ابن سعد ج۵ ص ۱۴۰ اور تقیید العلم ص ۵۲

رائج تھی۔ (۱)

پس ممنوعیت حدیث اور بنی امیہ کی سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کا صرف نام باقی

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۴۷ کہ وہ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۵-۶۴ سے نقل کرتا ہے، طبقات ابن سعد ج ۴ پہلا حصہ ص ۲۰۶

اہم نکتہ: یہودیوں کے دو گروہ تھے ایک گروہ تحریر اور تدوین کرنے پر عقیدہ رکھتا تھا جبکہ دوسرے گروہ کا نظریہ حفظ کرنے کا تھا اور صرف تورات کو تحریر کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ انہیں "قراء" کہا جاتا ہے "جیساکہ محمد حسن ضاضا" نے اپنی کتاب "التفکیر الدینی عند الیہود" میں اس کی تصریح کی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کعب الاحبار اسی قراء گروہ سے تھا۔ اس گروہ کی تعداد فریسیین کے کمزور پڑنے کے بعد زیادہ ہوگئی۔ (فریسیان یہودیوں کا فرقہ تھا جو حضرت عیسی (ع) کے زمانے میں تھا۔ یہ حضرت موسی (ع) سے تدریجاً نقل ہونے والی روایات کی تقلید کا قائل تھا۔ ان اقوال منقولہ کو شریعت کے مطابق بلکہ اس سے زیادہ اہم سمجھتا تھا) جیساکہ کعب الاحبار کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے جب حضرت عمر نے اس سے کسی شعر کے بارے میں پوچھا جو باتیں ان کے بارے میں کی گئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ "یہ اولاد اسماعیل میں سے ایک قوم ہے جن کے سینے میں انجیل ہے اور وہ حکیمانہ باتیں کرتے ہیں"، نیز وہب بن منبہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس طرح ایک طویل روایت جو البدایۃ و النہایۃ ج ۶ ص ٦٢ اور نزہۃ المجالس ج ۲ ص ۱۹۹ پر نقل کی گئی ہے کہ حضرت موسی (ع) نے کہا "اے میرے پروردگار میں نے تورات میں ایک امت کو دیکھا ہے کہ اپنی انجیلوں کو اس نے سینے سے لگا رکھا ہے اور اسے وہ پڑھتی ہے اور ان سے پہلے ایسا گروہ ہے جو حفظ نہیں کرتا بلکہ تحریر کیا ہوا پڑھتا ہے پس انہیں بھی میری امت میں سے قرار دے"۔ اللہ تعالی نے فرمایا "وہ محمد کی امت ہیں"۔ خلیفہ دوم نے شاید خوش فہمی کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے کعب الاحبار کہ جو ان کا منظور نظر تھا، سے یہ نظریہ قبول کیا ہو۔

رہ گیا اور قرآن کے الفاظ صرف باقی رہ گئے ہیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ امام مالک اپنے چچا ابوسہیل بن مالک اور وہ اپنے باپ سے نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا: "جس پر لوگ قائم ہیں وہ صرف نماز کی آواز ہے اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا" ۔ (۱)

زرقانی اور الباجی کہتے ہیں کہ "لوگوں سے مراد اصحاب ہیں۔ اعمال میں سے فقط اذان اپنی اصل شکل و صورت میں باقی تھی اور اس میں اصحاب نے تغیر و تبدل نہیں کیا تھا جبکہ نماز اور دوسرے افعال میں بہت سی تبدیلیاں کر دی گئیں اور نماز کے اوقات کو موخر کر دیا گیا" ۔ (۲)

بہر حال حدیث کی ممنوعیت والی سیاست حکام کی تدبیر اور چال سے ہم آہنگ اور مطابقت رکھتی ہے جو قرآن اور پیغمبر (ص) کی تعلیمات سے بڑھ جائیں وہ رسول اور قرآن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں' وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام کے اعتراضات ان پر اس حوالے سے کئے جائیں کہ یہ لوگ قرآن اور رسول (ص) کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اپنے آپ کو عوام کی مخالفت کے سامنے نہیں لانا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اور اس کی تفسیر کے بارے میں سوال کرنا ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ البتہ کتابت اور تلاوت ان کے بس میں نہیں تھا۔

اس سیاست کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ حکام ان آنے والے امور جو ان کے لئے خطرہ بن سکتے تھے' سے بھی اطمینان کامل حاصل کرنا چاہتے تھے خواہ وہ بعض شخصیات سے مربوط ہوں یا حکومت کے حریفوں اور رقیبوں سے ہوں۔ بہر حال جیسا بھی ہو ان امور کو نابود ہو جانا تھا یا مخفی رہ جانا تھا اور ان کا اثر تک باقی نہ رہتا تاکہ حکمرانوں کو ان امور سے پرہیز کرنے کی مشکل پیش نہ آئے یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

۱۔ جامع بیان العلم ج۲ ص ۲۴۴ اور الموطاء ج۱ ص ۹۳

۲۔ زرقانی کی الموطاء پر شرح ج۱ ص ۲۲۱' تنویر الحوالک ج۱ ص ۹۴-۹۳ کہ جو الباجی کی تالیف ہے۔

شافعی وھب بن کیسان سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے کہا "میں نے ابن زبیر کو دیکھا کہ نماز خطبوں سے پہلے پڑھ رہا ہے پھر اس نے کہا میں نے تمام سنن نبوی حتی نماز کو بھی تبدیل کر دیا ہے"۔ (۱)

زھری کہتا ہے کہ میں دمشق میں انس بن مالک کے پاس گیا وہ تنہا تھا اور رو رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیوں رو رہے ہو؟ جواب دیا "میں نے پہلے جو کچھ دیکھا تھا اس میں صرف نماز باقی تھی جبکہ اب وہ بھی ضائع ہو گئی ہے"۔ (۲)

حسن بصری کہتے ہیں "اس وقت اگر رسول اللہ (ص) کے اصحاب زندہ ہو جائیں تو تمہارے قبلے کے علاوہ کوئی چیز ان کے لئے جانی پہچانی نہ ہوتی۔ (۳) لیکن جیساکہ ہم نے پہلے بتایا کہ قبلہ بھی بدل چکا تھا۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص نے کہا ہے کہ "اگر سابقین امت میں سے دو افراد اپنے اپنے مصحف کے ساتھ ان دروں میں چلے گئے ہوتے اور آج وہ لوگوں کے پاس آتے تو جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اس میں سے ایک چیز بھی نہ دیکھ پاتے۔ (۴)

جب عمران بن حصین نے حضرت علیؑ کے پیچھے نماز پڑھی تو مطرف بن عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ علیؑ ویسے نماز پڑھتے ہیں جیسے حضرت محمدؐ پڑھا کرتے تھے آج علیؑ کی نماز سے حضور اکرم (ص) کی نماز کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ (۵)

۱۔ شافعی کی کتاب الامام ج۱ ص ۲۰۸

۲۔ جامع بیان العلم ج۲ ص ۲۴۳ اور ضحی الاسلام ج۱ ص ۳۶۵ کہ اس نے بخاری اور ترمذی سے نقل کیا ہے' کی طرف رجوع کریں۔ اسی طرح الزھد والرقائق ص ۵۳۱ اور اس کے حاشیے میں طبقات ابن سعد' سوانح حیات انس اور ترمذی سے نقل کیا گیا ہے ج۳ ص ۳۰۲

۳۔ جامع بیان العلم ج۲ ص ۲۴۳

۴۔ ابن المبارک کی کتاب الزھد والرقائق ص ۶۱

۵۔ انساب الاشرف ج۲ ص ۱۸۰' سنن البیھقی ج۲ ص ۶۸' کنز العمال ج۸ ص ۱۴۳

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ رسول اللہ (ص) کی سنت کی عمداً مخالفت کی گئی کیونکہ حضرت امیر المومنینؑ اپنے لئے سنت کی حفاظت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ: "اے اللہ ان لوگوں پر لعنت فرما جنھوں نے بغض علیؑ میں رسول خداؐ کی سنت کو بھی ترک کر دیا"۔ (۱) اس بارے میں سندی کہتا ہے کہ "یعنی حضرت علیؑ آنحضرتؐ کی سنت کے پابند تھے۔ (۲)

نماز میں بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے کو ترک کرنے کے بارے میں نیشاپوری کہتا ہے کہ "اسی طرح ایک اور تہمت لگائی گئی ہے کہ علیؑ نے بسم اللہ کے بلند پڑھنے میں مبالغہ کیا ہے۔ لہذا بنی امیہ کے دور میں علیؑ کے آثار کو نابود کرنے کی کوشش میں بسم اللہ بالجہر کے ترک میں افراط اور مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ (۳)

بات یہاں تک پہنچی کہ بعض مورخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ "امام سجادؑ کے زمانے میں ہاشمی اور دوسرے عوام الناس نہیں جانتے تھے کہ کیسے نماز پڑھی جاتی ہے اور حج کیسے انجام دیا جاتا ہے۔ (۴) سید مہدی الروحانی نقل کرتے ہیں کہ ابان بن تغلب کی سوانح حیات میں مذکور ہے کہ انھوں نے کہا "شیعہ حلال و حرام اور مسائل حج کو نہیں جانتے تھے مگر اتنی مقدار میں جو علماء اہلسنت حضرت علیؑ سے نقل کرتے تھے"۔

کہ جس نے عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے

۱۔ سنن النسائی ج۵ ص ۲۵۳، سنن البیہقی ج۵ ص ۱۱۳ اور الغدیر ج ۱۰ ص ۲۰۵ کہ ان دونوں نے کنزالعمال سے اور ابن جریر سے ایک اور نص کے ذریعے نقل کیا ہے۔

۲۔ تعلیقہ السندی جو سنن النسائی پر حاشیہ ہے ج۵ ص ۲۵۳

۳۔ تفسیر نیشاپوری تفسیر طبری کے حاشیے میں ج۱ ص ۷۹

۴۔ کشف القناع عن حجیتہ الاجماع ص ٦٤

اس لحاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب نماز (جو اسلام کا عظیم رکن اور دین کا ستون ہے اور جسے ایک مسلمان روزانہ پانچ مرتبہ ادا کرتا ہے) کا یہ حال کہ وحی اور قرآن کے نزدیک ترین افراد اس کے احکام اور مسائل کو نہیں جانتے تھے جنہیں ان مسائل کا سب سے زیادہ علم ہونا چاہیے تھا تو امت کے دوسرے لوگوں کی دین سے معرفت اور احکام اسلام سے آگاہی کی کیا صورت حال ہوگی خصوصا وہ لوگ جو احکام کے علم اور معرفت کے سرچشمے سے بہت دور تھے بالخصوص ان مسائل میں جن کی انہیں کم ضرورت پڑتی تھی۔

اس صورت حال کے پیش نظر یہ کہنا بجا ہے کہ اس زمانے میں جس شخص کو آنحضرتؐ کی تیس یا چالیس حدیثیں یاد ہوتی تھیں یا بعض احکام کو جانتا تھا تو وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم شمار کیا جاتا تھا، جیساکہ بعض فرقوں کی کتب رجال سے ظاہر ہوتا ہے۔ خصوصا جب وہ شخص اپنے ذاتی استنباط کے ذریعے ان یاد کی ہوئی احادیث پر کچھ اضافے بھی کرے کیونکہ اس پر کوئی نگران ہے نہ اس کا کوئی مد مقابل اور نہ ہی ان چیزوں کی کوئی تمیز کرنے والا ہے۔

اس لئے ہمیں جعلسازوں، کاذبوں بلکہ اہل کتاب میں سے ظاہری طور پر اسلام لانے والوں کا بازار نہایت گرم نظر آتا ہے۔ ان کا شمار علم و معرفت اور امت کی تہذیب و ثقافت کے سرچشموں میں کیا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ انہوں نے حکمرانوں اور سلطانوں کے جھنڈے تلے جا کر پناہ لی جبکہ نبیؐ کے اہلبیت کو میدان سے خارج اور کنارہ کش ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بارے میں امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اللهم ان هذا المقام لخلفائك و اصفيائك، و مواضع امنائك في الدرجة الرفيعة التي اختصصتهم بها قد ابتزوها. حتى عاد صفوتك و خلفاؤك مغلوبين مقهورين مبتزين يرون حكمك مبدلا و كتابك منبوذا و فرائضك محرفة عن جهات اشراعك و سنن نبيك متروكة الخ ... (۱)"

۱۔ الصحیفہ السجادیہ (اڑتالیسویں دعا) دعائے روز جمعہ اور عرفہ

"اے پروردگار! یہ مقام (حکومت) تیرے خلفاء اور برگزیدہ بندوں کا حق ہے یہ بلند و اعلیٰ مراتب جو تو نے اپنے امین بندوں سے مختص کئے ہیں لیکن یہ مقام و منزلت ان سے چھین لئے گئے ... یہاں تک کہ یہ تیرے خلفاء اور برگزیدہ بندے ظاہری طور پر مغلوب، مقہور اور اپنے حق سے محروم کر دیئے گئے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ تیرا حکم تبدیل کر دیا گیا ہے، تیری کتاب سے بے اعتنائی برتی گئی ہے، تیرے احکام اور فرامین کو برعکس پیش کیا گیا ہے اور تیرے پیغمبرؐ کی سنت کو ترک کر دیا گیا ہے"۔

اس موضوع کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اس پر علیحدہ سے بحث اور گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں ہم نے اپنی کتاب "دراسات و بحوث فی التاریخ و الاسلام" میں "امام سجادؑ اسلام کو زندہ کرنے والی شخصیت" کے عنوان کے تحت کچھ گفتگو کی ہے۔ خواہشمند احباب وہاں رجوع کر سکتے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اس اہم موضوع پر غور و فکر کی توفیق عطا فرمائے (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

روایات کو جانچنے کے اصول

رسول اکرمؐ کی شخصیت اور تمام مقدسات اسلام بلکہ اسلام کی اساس ہی کے خلاف ہونے والی ناپاک سازش (جس کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا) کے پیش نظر ہم اس بات کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم تاریخ اسلام، تاریخ پیغمبرؐ اور آنحضرتؐ کی احادیث کے متون کو جانچتے وقت درج ذیل نکات کو مدنظر رکھیں:۔

روایت اور نص کا لغوی اور نحوی قواعد کے مطابق ہونا، حدیث سازوں، جھوٹوں اور سیاسی مفادات رکھنے والوں سے روایت کی سند کا پاک اور خالی ہونا، راویان حدیث کے حالات زندگی نیز ان کے سیاسی اور ذاتی مفادات کے حامل روابط کو مدنظر رکھنا، تضاد گوئی اور تعارض سے روایت کا مبرا ہونا اور تاریخی لحاظ سے اس کے امکان کا ثابت ہونا۔ (۱)

علاوہ ازیں روایات کی جانچ پڑتال اور تحقیق کے لئے ہمیں اور ہر دوسرے شخص کو مذکورہ معیار اور دوسرے معیاروں کے علاوہ درج ذیل اصولوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے:۔

۱۔ قرآن کریم سے موازنہ کرنا، رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

"تکثر لکم الاحادیث بعدی فاذا روی لکم عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ، فما وافق کتاب اللہ فاقبلوہ، و ماخالف فردوہ". (۲) یعنی میرے بعد تمہارے لئے کثیر تعداد

۱۔ جو معیار بیان کیا گیا ہے اس پر صرف آئمہ معصومین علیہم السلام سے صادر ہونے والی روایات ہی کے معاملے میں ان کو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے لیکن تاریخی نصوص میں کبھی ان تمام نکات کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے خصوصاً سند کے لحاظ سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر تاریخ کی نگارش غیر امین افراد کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔ جیساکہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ لہذا نہایت ضروری ہے کہ قابل اعتماد تاریخ کی حیثیت سے پیش کرنے سے پہلے تاریخ کے متعلق روایات کے بارے میں عدم تحریف، عدم جعل اور دیگر نکات پر باریک بینی سے تحقیق کی جائے۔

۲۔ شاشی کی اصول الحنفیہ ص ۴۳

میں حدیثیں لائی جائے گی، پس اگر میرے بعد تمہارے سامنے کوئی حدیث نقل کی جائے تو اسے کتاب الٰہی پر پیش کرو، جو حدیث کتاب کے موافق ہو اسے قبول کر لو اور جو مخالف ہو اسے رد کر دو۔

اس بارے میں ابن عباس کہتا ہے کہ "اگر تم مجھ سے رسول اللہ کی کوئی حدیث سنو اور اسے تم کتاب خدا میں نہ پاؤ یا لوگوں کے نزدیک اسے پسندیدہ نہ پاؤ تو سمجھ لو کہ میں نے رسول اللہ پر جھوٹ باندھا ہے"۔ (۱)

ابن مسعود نے کہا ہے کہ "غور کرو جو کتاب اللہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو اسے قبول کر لو اور جو اس کے مخالف ہو اسے رد کر دو"۔ (۲)

حضرت ابوبکر نے اپنے ایک خطبے میں کہا ہے "اگر حق و باطل کے درمیان معرکہ ہو اور باطل نے سنت کو مٹا دیا اور حق کو نابود کر دیا ہو تو ان حالات میں تم مسجدوں کے ساتھ رہو اور قرآن سے مشورہ طلب کرو"۔ (۳)

ابی ابن کعب نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے کہا "اللہ کی کتاب کو اپنے سامنے رکھو اور اس کے حکم اور فیصلے پر راضی رہو"۔ (۴)

معاذ نے اس بارے میں یوں کہا ہے "تمام اقوال کو کتاب الٰہی کے سامنے پیش کرو لیکن اسے (کتاب خدا کو) کسی اور چیز سے نہ جانچو۔ (۵)

۱۔ سنن الدارمی جلد ۱ صفحہ ۱۴۶

۲۔ المصنف جلد ٦ صفحہ ۱۱۲ اور رجوع کریں خطبہ ابن مسعود جلد ۱۱ صفحہ ۱٦۰ نیز جامع بیان العلم جلد ۲ صفحہ ۴۲ اور حیات الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۱۹۱ کی طرف، جس نے جامع بیان العلم سے نقل کیا ہے۔

۳۔ ابن قتیبہ کی عیون الاخبار جلد ۲ صفحہ ۲۳۳ بیان و التبیین جلد ۲ صفحہ ۴۳ العقد الفرید جلد ۴ صفحہ ٦۰

۴۔ حلیۃ الاولیاء جلد ۱ صفحہ ۲۵۳ و حیاۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۵۲٦

۵۔ حیات الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۱۹۷ میں کنز العمال جلد ۸ صفحہ ۸۷ سے اور اس میں ابن عساکر سے نقل ہوا ہے۔

اس بارے میں حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "جو چیز کتاب اللہ کے مطابق نہیں ہے وہ باطل اور جھوٹ ہے"۔ (۱)

امام سجادؑ نے قرآن کے معیار ہونے کے متعلق فرمایا کہ "قرآن عدالت کی پہچان کا وہ معیار اور پیمانہ ہے جس کی زبان کبھی بھی حق سے تجاوز نہیں کرتی، یہ ایسا نور ہدایت ہے جس کا برہان مشاہدہ کرنے والوں پر کبھی بھی مخفی اور پوشیدہ نہیں ہوگا یہ نجات کا وہ پرچم ہے جس کے اصولوں کی پیروی کرنے والا گمراہ نہیں ہوگا"۔

آئمہ اہل بیتؑ سے اس قسم کی روایات بکثرت منقول ہیں۔ مذکورہ باتوں کی روشنی میں بعض لوگوں کے اس قول کی کوئی گنجائش اور اہمیت نہیں کہ "سنت کتاب پر حاکم ہے اور کتاب سنت پر حاکم نہیں ہے"۔ (۲)

اسی طرح ابوبکر بیہقی کی اس بات کی کوئی وقعت نہیں ہے کہ "وہ حدیث جو احادیث کو قرآن پر پیش کرنے کا ذکر کرتی ہے، جھوٹی اور باطل ہے بلکہ اس کے برعکس ہے اور خود اپنے بطلان پر دال ہے کیونکہ قرآن میں احادیث کو قرآن پر پیش کرنے کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے"۔ (۳)

اسی طرح عبدالرحمان بن مہدی کا یہ کہنا فضول ہے کہ اس حدیث کو خوارج اور بے دین و منافق افراد نے جعل کیا ہے یعنی آپؐ کی یہ حدیث جس میں آپؐ نے فرمایا: "جو حدیث میرے حوالے سے تم تک پہنچے اسے کتاب خدا پر پیش کرو اگر وہ اس کے موافق ہو تو سمجھ لو وہ میرا قول ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو وہ میرا قول نہیں ہے، میں

۱۔ اصول کافی ج۱ ص ۵۵ اور اسی باب اور بہت سی روایات میں جو چاہتا ہے وہ ان کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ تاویل مختلف الحدیث ص ۱۹۹، سنن الدارمی ج۱ ص ۱۴۵، مقالات الاسلامیین ج۲ ص ۳۲۴ اور جامع بیان العلم ج۲ ص ۲۳۴

۳۔ بیہقی کی دلائل النبوۃ ج۱ ص ۲۶

کتاب الٰہی کے مطابق گفتگو کرتا ہوں قرآن کے ذریعے خداوند متعال میری ہدایت کرتا ہے"۔
اور ان الفاظ کو آنحضرتؐ سے منسوب کرنا ان صاحبان علم کی نظر میں درست اور صحیح نہیں ہے جو صحیح کو غیر صحیح تشخیص دے سکتے ہیں۔ بعض علماء نے اسی حدیث کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم پہلے اسی حدیث کو قرآن پر پیش کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حدیث قرآن کے برخلاف ہے کیونکہ ہمیں قرآن میں کہیں بھی یہ بات نہیں ملتی کہ صرف اس حدیث نبوی کو قبول کرو جو قرآن سے مطابقت رکھتی ہو بلکہ قرآن آنحضرتؐ کی پیروی اور ان کے اوامر کی اطاعت کو بطور مطلق لازم قرار دیتا ہے اور اسی طرح ان کے حکم کی مخالفت کی بات بھی عمومی طور پر کرتا ہے۔ (۱)

ابو عمر کہتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کی پیروی اور اتباع کا بطور مطلق حکم دیا ہے اور اسے کسی چیز سے مقید نہیں کیا جس طرح ہمیں قرآن کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو کتاب اللہ سے موافق ہو، جیسا کہ بعض اہل باطل کہتے ہیں۔ (۲)

ہم یہاں پر بیہقی، ابن عدی اور ابو عمر سے یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ تم نے بھی اشتباہ کیا ہے اور جن اہل علم کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے وہ بھی دھوکہ کھا گئے ہیں۔

کیونکہ تمہاری یہ بات کہ ہم نے اس حکم کو قرآن میں نہیں پایا، کتاب کی مخالفت یا موافقت پر دلالت نہیں کرتی۔ ہم نہیں جانتے قرآن کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے؟ کیا تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن ہر کلی اور جزئی امر کے بارے میں واضح طور پر حکم بیان کرے؟ اگر ایسا ہو تو اس صورت میں قرآن کا حجم کتنا ہوگا؟ علاوہ ازیں قرآن کو حفظ کرنا اور اس سے استفادہ کیسے ممکن ہوگا؟

۱۔ جامع بیان العلم ج۲ ص ۲۳۳، اس روایت اور گذشتہ تمام موارد کے سلسلے میں کتاب بحوث مع اہل السنۃ و السلفیۃ کے ص ۶۷ اور ۶۸ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ جامع بیان العلم ج۲ ص ۲۳۳

اس کے علاوہ کہ یہ حدیث، موافق کو قبول اور مخالفت کو رد کرنے کی بات کر رہی ہے لیکن وہ حدیث جو نہ موافق قرآن ہے نہ مخالف تو وہ حجیت اخبار کی دلیلوں کے تحت باقی رہے گی۔ (۱)

اس حدیث کے بارے میں جو کہتی ہے کہ "تم سے وہ شخص مسند استراحت پر تکیہ نہیں لگائے گا (یعنی آرام و چین سے نہیں بیٹھے گا) کہ جس کے پاس میرے اوامر اور نواہی پہنچ جائیں" تو وہ کہتا ہے کہ "میں کچھ نہیں جانتا، میں نے کتاب الٰہی میں کچھ نہیں پایا جو اس کی اتباع کروں"۔

خطابی نے کہا کہ "خود حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حدیث کو کتاب پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے (لیکن ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث کیسے اس پر دلالت کرتی ہے) وہ مزید یہ کہتا ہے کہ جو چیز بھی ثابت ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہے وہ خودبخود حجت ہے اور بعض علماء کا یہ بیان کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے اگر کوئی حدیث تم تک پہنچے تو کتاب خدا پر اسے پیش کرو، اگر موافق ہو تو قبول کر لو ورنہ ..... " تو واضح ہوا کہ یہ روایت باطل ہے اور اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے اس کے متعلق زکریا ساجی نے یحیٰی بن معین سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو بے دین افراد نے جعل کیا ہے"۔ (۲)

اگر ان تمام کو نظر انداز بھی کر دیا جائے لیکن یہ لوگ حضرت عمر کے قول کی کیا توجیہ پیش کریں گے جو انہوں نے رسول اکرمؐ کی رحلت کے موقع پر کہا تھا کہ "حسبنا کتاب اللہ" یعنی ہمارے لئے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن کو صرف قبروں پر پڑھنے اور مجالس ترحیم میں تلاوت کرنے کے لئے یا اسے اپنے سینے سے لگائے رکھنے یا خوبصورت الماریوں میں

۱۔ یہ کلام علامہ محقق سید مہدی روحانی کا ہے۔ خدا ان کی حفاظت کرے۔

۲۔ سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود ج۴ ص ۳۵۶

اور دلنشین آوازوں میں پڑھنے کے لئے ہی نازل کیا تھا؟ کیا قرآن مُردوں کی کتاب ہے اور زندہ لوگوں کے لئے نہیں؟ قرآن مجید کے سیاسی، اجتماعی اور فقہی احکام، اس کے اوامر و نواہی اور دوسرے پہلوؤں کی کیا خاصیت ہے؟

اگر ان کی بات قبول کر لی جائے تو اس صورت میں قرآن کے ان اقوال کا کیا فائدہ ہوگا اور ان کی اہمیت رہ جائے گی جیساکہ قرآن فرماتا ہے "ھدی للمتقین" (یعنی قرآن متقین کی ہدایت کرتا ہے)۔ "یھدی للتی ھی اقوم" (یعنی قرآن محکم ترین انداز سے ہدایت کرتا ہے) اور "فلا یتدبرون القرآن" (یعنی کیا وہ قرآن پر غور و فکر نہیں کرتے؟) اسی طرح کی اور بہت سی آیات موجود ہیں۔

اس صورت میں رسول اکرمؐ کے اس فرمان کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے کہ قرآن دو گراں قدر چیزوں میں سے ایک ہے جن سے تمسک رکھنے والا قیامت تک گمراہ نہیں ہوگا؟

اگر قرآن لوگوں کی زندگی، معاش اور دین سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تو پھر ان بے معنی اور بے مفہوم الفاظ کو تلاوت کرنے اور انہیں حفظ کرنے کا لوگوں کو حکم دینا فضول اور بیہودہ ہوگا؟ (نعوذ باللہ)

آخر سوال یہ ہے کہ اگر ایسا تھا تو پھر علماء اور مفکرین نے تفسیر قرآن، اس کے الفاظ کی تشریح اور اس کے معانی و مقاصد کو بیان کرنے میں جو کوششیں کی ہیں اور ان چیزوں کو اس قدر اہمیت دی ہے وہ کس لئے تھا؟

ان کے علاوہ اور بہت سے سوالات باقی ہیں جن کا یہ لوگ کبھی بھی قانع کنندہ اور مفید جواب نہیں دے پائیں گے۔

یہ سب کچھ کہنے کے باوجود ہم حیرت زدہ ہیں کہ کیا کریں۔ ایک طرف تو حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور دیگر اموی خلفاء احادیث رسول اللہؐ کو نقل کرنے اور لکھنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اصحاب کی تحریر کردہ احادیث کو جمع کر کے جلا دیتے ہیں۔ جیساکہ حضرت عمر بن خطاب اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں خدا کی کتاب کافی اور وافی ہے لیکن جب قرآن کے

معانی اور تفسیر کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو پوچھنے والے کو ضرب و شتم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف یہی لوگ کتاب کو چھوڑنے اور سنت کو اس پر مقدم کرنے پر مصر ہیں۔

۲۔ وہ شخص جو سیرت نبیؐ میں تحقیق اور جستجو کرنا چاہتا ہے سب سے پہلے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی شخصیت کی حدود کا تعین کرے اوران حدود سے صحیح اساس کے مطابق آگاہی حاصل کرے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اسے قرآن پر تکیہ کرنا چاہئے اور عقل و فطرت کے قطعی فیصلوں پر اعتماد کرنا چاہئے اس کے بعد یہ دیکھیں کہ مورد نظر حدیث اور نص خواہ کتاب سے بھی لی گئی ہو، اور جیسی بھی ہو، پیغمبرؐ کے شمائل اور شخصیت سے مناسب انداز میں مطابقت رکھتی ہے یا نہیں البتہ ان باتوں کی روشنی میں جو ہم نے بیان کی ہیں کہ آپؐ انسانیت کے لئے اعلیٰ اور عظیم ترین نمونہ ہیں۔ آپؐ کی ذات بلند ترین صفات وکمالات اور تمام انسانی فضائل سے آراستہ ہے۔

پس اگر حدیث یا نص مذکورہ معیاروں پر پورا اترتی ہو تو پھر جذباتی اور سیاسی عوامل سے متاثر ہوئے بغیر اور ہر قسم کی مصلحت اور مفاد کو بالائے طاق رکھ کر ہم اسے قبول کریں گے ورنہ اس کے رد کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے۔ بصورت دیگر اس بات کو کیسے قبول کر لیا جائے کہ فلاں مرجع دینی فلاں عمومی جگہ پر شراب پیتا تھا یا فلاں مشہور گلوکارہ کے لئے اس نے گانا لکھا؟ چہ جائیکہ انہیں یا ان سے بھی گھٹیا ترین باتوں کو آنحضرتؐ کی ذات مقدس سے منسوب کیا جائے۔

۳۔ نص یاروایت کو جانچنے کی تیسری شرط یہ ہے کہ وہ بدیہیات عقلی کے خلاف نہ ہو، قرآن نے عقل کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اسے حکم (ثالث) قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کی سرزنش کی ہے جو عقل کے ذریعے سے ہدایت نہیں پاتے۔ قرآن ہم سے کسی ایسی بات کا ہرگز تقاضا نہیں کرسکتا جو عقل کے برخلاف ہو یعنی ہم سے منوائے کہ چار کا نصف دو نہیں ہے وغیرہ۔

دوسرے مسائل مثلاً تاریخی اور نظریاتی وغیرہ میں بھی عقل کا ہی معیار ہمارے پیش نظر رہنا چاہئے ان تمام امور میں بھی ہمارا موقف بنیادی طور پر ٹھوس حقائق پر مبنی ہونا چاہئے۔

نتیجہ:

گذشتہ تمام باتوں اور مذکورہ معیاروں کی روشنی میں ان کثیر روایات کی بے وقعتی کا اندازہ ہو جاتا ہے جو ہمارے پیارے نبیؐ کا تعارف ایک عاجز، جاہل، حقیر اور ذلیل شخص کے طور پر کراتی ہیں۔ اس اساس پر ان جعلی روایات کے لئے اسلام کے عقائد، تاریخ اور فقہ میں اس طرح کے اثر و نفوذ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، جس کی رو سے وہ اسلام کے اصولوں اور اس کی حقیقت، مسلمانوں کی حقیقت اور رسول اکرمؐ کی تاریخ کے منافی تصویر پیش کر سکیں۔ کیونکہ ان کی حقیقت جان لی گئی ہے۔

اس مقام پر ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اس وقت ہم اس پاک و پاکیزہ میراث کو پیش کر سکتے ہیں جو درحقیقت مسلمین کے لئے عظمت و افتخار کا سرچشمہ ہے بلکہ ہر انسان کے لئے خواہ وہ کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو تاکہ ہم ان امور کو جو موجودہ دور اور حالات میں قوی اور ضعیف نکات کی نشاندہی میں ہماری مدد کرتے ہیں، حاصل کر سکیں اور ان کی روشنی میں ایک تابناک مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔

طبیعی آغاز:

واضح ہے کہ تاریخ اسلام کا طبیعی آغاز اور اس کا بہت بڑا حصہ نبی اکرمؐ کی پاکیزہ اور عطر آگین سیرت ہے اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم قبل از بعثت کی تاریخ کا بھی کچھ تذکرہ کریں تاکہ جس قسم کے حالات اور ماحول میں دین حق (جو خدا کے نزدیک وہی اسلام ہے) کی دعوت دی گئی اس سے ہم آگاہ ہو جائیں۔

پہلا باب

بعثت سے پہلے کے حالات

پہلی فصل: آنحضرتؐ کی ولادت سے پہلے
دوسری فصل: آنحضرتؐ کی ولادت سے لیکر بعثت تک
تیسری فصل: تذکرہ سیرت سے پہلے کچھ باتیں

پہلی فصل

آنحضرتؐ کی ولادت سے پہلے

جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی حالات

یہ ایک مستطیل جزیرہ نما ہے جس کی سرحدیں شمال میں فرات اور اس کے آخر میں دشت شام، سماوہ اور فلسطین، مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں خلیج عدن اور بحر ہند اور مغرب میں بحیرہ احمر سے جا ملتی ہیں۔

یہاں جغرافیائی حالات سے ہماری مراد درج ذیل امور ہیں۔

اول: جزیرۃ العرب میں ایک بھی دریا موجود نہیں ہے اکثر پہاڑ، درے اور صحرا ہیں جو بے آب و گیاہ ہیں اور زراعت کے قابل نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ کسی ایک جگہ مقیم ہو کر زندگی گزارنے کے لائق نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے لہذا گذشتہ دور میں اس سرزمین کے اکثر باشندے بلکہ بقول ۹/۱۰ لوگ خانہ بدوش اور مہاجر تھے جو صبح کہیں ہوتے تھے تو شام کو کہیں اور۔

دوم: اس صورت حال کی بنا پر یہ علاقہ اس زمانے کی دو سپر طاقتوں یعنی ایران و روم اور دوسروں کے تسلط سے محفوظ رہا اور اس طرح وہاں کے مذاہب و ادیان کے اثرات سے دور رہا یہاں تک کہ یہودی، رومی حکمرانوں کے ڈر سے جزیرۃ العرب فرار کر جاتے اور یثرب مدینہ یا حجاز کے دوسرے شہروں میں چلے جاتے۔ ان حالات کے نتیجے میں قبیلوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں وجود میں آئیں۔ ہر قبیلے کا اپنا ایک حاکم اور ہر طاقتور فرد سلطان ہوتا تھا۔

سوم: دشوار گزار زندگی اور قبائلی نظام حکومت کے ساتھ ساتھ ذہن و وجدان کے

فقدان کے باعث یہ قبائل ہمیشہ آپس میں لوٹ مار اور قتل و غارت میں مشغول رہتے تھے۔ یہ لوٹ مار یا تو ذریعہ معاش کے طور پہ ہوتی تھی یا پھر حصول اقتدار اور بالادستی کے لئے اور بعض اوقات اس کی وجہ انتقام اور خونخواہی یا پھر دوسرے عوامل ہوتے تھے۔ اس طرح جو قبیلہ دوسرے قبیلے پر مسلط ہو جاتا وہ اس کے اموال پر قبضہ کر لیتا، ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر بنا لیتا اور اس کے مردوں کو قتل کر دیتا یا پھر انہیں بھی قیدی بنا لیتا۔ اس کے بعد شکست خوردہ قبیلہ اپنی شکست کی تلافی کے لئے موقع کے انتظار میں رہتا اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا۔

ان حالات میں قبیلہ کے تمام افراد کے درمیان قوی اور گہرے جذبات کا پایا جانا ایک طبیعی سی بات ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک جانتا تھا کہ اسے اپنی زندگی سے دفاع کے لئے دوسرے کی ضرورت ہے۔ یہی چیز شدید قبائلی تعصب کا باعث تھی کہ جس کی وجہ سے ان کے نزدیک رحم، مہربانی اور اخلاق وغیرہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی لہذا وہ ہمیشہ اپنے ہی قبیلے کے فرد کی حمایت کرتے تھے چاہے وہ حق پہ ہوتا یا باطل پر۔ یہاں تک کہ اس بات کی مدح میں زمانہ جاہلیت کا ایک شاعر کہتا ہے۔

لا یسئلون اخاھم حین یندبھم

فی النائبات علی ما قال برھانا

۔ یعنی مشکل وقت میں جب کوئی اپنے بھائی سے کمک کی درخواست کرتا ہے تو وہ اس سے دلیل طلب نہیں کرتا۔

دوسری طرف ہمیشہ قبیلہ اپنے ہر فرد کے ظلم یا خسارے کا ذمہ دار ہوتا تھا اور اسے بری نیت رکھنے والوں کی آزار و اذیت سے بچاتا تھا بلکہ کسی بے جرم سے بھی انتقام لے کر دل کی بھڑاس بجھا لیتے اور شوق انتقام پورا کرتے تھے بشرطیکہ وہ (بے جرم شخص) اس (مجرم) کا ہم قبیلہ ہوتا۔

جزیرہ نمائے عرب کے شہری

جزیرۃ العرب کے شہری یعنی شہروں میں سکونت رکھنے والے اگرچہ خانہ بدوشوں کی نسبت بہتر زندگی بسر کرتے تھے لیکن یہ امتیاز اس حد تک نہیں تھا کہ اسے ان دونوں کے درمیان ایک بڑا فرق قرار دیا جاسکے۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی سطح فکر، مفاہیم و عادات و رسوم اور طرز زندگی میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی تھی۔ یہ اس وقت ہے کہ جب ہم یہ نہ کہیں کہ بادیہ نشین جسمانی لحاظ سے بہتر، زبان کے لحاظ سے فصیح تر، دل کے زیادہ قوی اور نفس، فکر اور سلیقہ کے اعتبار سے زیادہ پاک و پاکیزہ تھے۔ لیکن پھر بھی بیشتر موارد میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا امتیاز اور برتری اس حد تک نہیں ہے کہ ایک محقق اس پر تحقیق کے لئے ایک جداگانہ باب مختص کرے بالخصوص حجاز کے شہریوں کے لئے۔

مختصر یہ کہ ہمیں اسلام سے پہلے کی تاریخ میں ان دو گروہوں میں سے کسی ایک کی دوسرے پر برتری دکھائی نہیں دیتی جیساکہ امیر المومنین علیؑ اور دیگر افراد کے کلام سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے جس کا بعد میں ذکر کیا جائے گا لہذا اسے ایک جداگانہ باب میں لانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔

عربوں کے اجتماعی حالات

جو شخص بھی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے واضح طور پر دیکھتا ہے کہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں عرب اجتماعی لحاظ سے کس قدر پستی اور برائی کا شکار تھے۔ جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے قتل و غارت، لوٹ مار اور قبائلی تعصب وغیرہ اس دور کے عربوں کی خصوصیات تھیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی قبیلہ کو لوٹ مار کے لئے کوئی دشمن نہ ملتا تو وہ اپنے دوستوں حتی اپنے چچازاد بھائیوں پر ہی ٹوٹ پڑتا تھا۔ قطامی کہتا ہے۔

و کن اذا اغرن علی قبیل

و اعوزهن نهب حیث کانا

اغرن من الضباب علی حلال (۱)

و ضبة انه من حان حانا

و احیاناً علی بکر اخینا

اذا ما لم نجد الا اخانا

- "ضباب" اور "ضبہ" قبیلوں نے جب دوسرے قبیلے پر حملہ کیا اور لوٹ مار سے ان کی ضرورت پوری نہ ہوئی تو انہوں نے اپنے گردونواح میں چھوٹے چھوٹے قبائل پر حملہ کر دیا۔ اور اگر کبھی لوٹ مار کے لئے ہمیں اپنے بھائی "بکر" کے سوا کوئی نہ ملے تو ہم اسی پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کو درپیش زندگی کی مشکلات اور فقر و فاقے، غلط نظریات (خاص کر عورتوں کے بارے میں) نیز جنگ اور لوٹ مار (جن کا مقصد عورتوں کو اسیر بنانا) کی فضا نے ان کو اپنی اولاد (خاص کر بیٹیوں) کے قتل یا زندہ دفن کرنے پر مجبور کیا تھا۔ بنی تمیم، قیس، اسد، ھذیل اور بکر بن وائل جیسے قبائل میں اس کا رواج تھا۔ (۲)

قرآن میں اولاد کو زندہ درگور کرنے کے مسئلے کے تذکرے، ان کو اس عمل سے منع کرنے اور اس کی مذمت سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زندہ دفن کرنے کی رسم کس قدر رائج تھی۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

و لاتقتلوا اولادکم خشیة املاق، نحن نرزقکم و ایاھم. (۳)

اپنی اولاد کو فقر و فاقے کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم ہیں جو تمہیں اور انہیں روزی دیں گے۔

۱۔ ضباب ایک قبیلے کا نام ہے اور حلال سے مراد ہے نزدیک رہنے والا۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابی الحدید معتزلی ج۱ ص ۱۷۳

۳۔ سورہ اسراء، آیت ۳۱

نیز ایک اور جگہ فرماتا ہے:۔ "و اذا الموؤدۃ سئلت، بای ذنب قتلت". (۱) "یعنی اور جب زندہ دفن شدہ لڑکیوں سے سوال کیا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں قتل ہوئیں"۔

اسی طرح پیغمبر اکرمؐ نے بھی بیعت عقبہ کے موقع پر اس سے نہی کی تصریح فرمائی۔ محمد بن اسماعیل تیمی وغیرہ نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ فقط اولاد کے قتل کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ قتل کے علاوہ قطع رحمی بھی ہے اور اسی وجہ سے اس سے بچنے کی زیادہ تاکید کی گئی ہے اسی کے علاوہ فقر کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے اور لڑکیوں کو قتل کرنے کا رواج عام تھا۔ (۲)

عورت دور جاہلیت میں:

جاہلیت کے دور میں عورتوں کی زندگی انتہائی دشوار اور سخت و پر مشقت ہوتی تھی اس وقت کے مرد کے سامنے عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لہذا ہم اس پر مزید بحث کی ضرورت محسوس نہیں کرتے فقط خداوند عالم کے اس فرمان کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

"و اذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسوداً و ھو کظیم، یتواری من القوم من سوء ما بشر بہ، ایمسکہ علی ھون ام یدسہ فی التراب الاساء مایحکمون". (۳) "یعنی اور اگر ان میں سے کسی کو بیٹی کی (ولادت) کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ (غصہ سے) سیاہ ہو جاتا ہے اور دل کے اندر غم کا تلاطم ہوتا ہے۔ وہ اس بری خبر پر اپنی قوم سے چھپتا پھرتا (اور سوچتا) ہے کہ کیا وہ اس کو ذلت کے ساتھ سنبھال رکھے یا مٹی میں دفن کرے"

۱۔ سورہ تکویر، آیت ۸ و ۹

۲۔ فتح الباری ج۱ ص ۶۱

۳۔ سورہ النحل، آیت ۵۸ و ۵۹

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ "خضری" (مشہور عرب مصنف) قرآن کو جھٹلانے کی فکر میں تھا کیونکہ اس نے ادعا کیا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب، عورت کا اکرام و احترام کرتے تھے۔ (۱)

جاہلیت میں عربوں کے حالات کے چند نمونے:

ایام جاہلیت میں عربوں کی حالت کے بارے میں امیر المومنینؑ کے بعض فرمودات کا ذکر ہی کافی ہے۔

آپؑ نے فرمایا: "بعثه و الناس ضلال فی حیرة، و حاطبون فی فتنة، قد استهوتهم الاهواء، و استزلتهم الکبریاء، و استخفتهم الجاهلیة الجهلاء، حیاری فی زلزال من الامر، و بلاء من الجهل". (۲) یعنی "خداوند عالم نے پیغمبرؐ کو اس وقت مبعوث فرمایا جب لوگ حیرت و پریشانی میں گم کردہ راہ تھے اور فتنوں میں ہاتھ پیر مار رہے تھے نفسانی خواہشوں نے انہیں بھٹکا رکھا تھا اور غرور نے بہکا دیا تھا۔ بھرپور جاہلیت نے ان کی عقلیں کھو دی تھیں اور حالات کے ڈانواں ڈول ہونے اور جہالت کی بلاؤں کی وجہ سے حیران و پریشان تھے"۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: "و انتم معشر العرب علی شر دین، و فی شر دار، تنیخون بین حجارة خشن، و حیات صم، تشربون الکدر، و تاکلون الجشب، و تسفکون دمائکم، و تقطعون ارحامکم، الاصنام فیکم منصوبة، و الاثام فیکم معصوبة". (۳) یعنی "اے گروہ عرب اس وقت تم بد ترین دین پر اور بد ترین گھروں میں تھے۔ کھردرے پتھروں اور زہریلے سانپوں میں تم بود و باش رکھتے تھے۔ بت تمہارے درمیان گڑے ہوئے تھے اور گناہ تم سے چمٹے ہوئے تھے"۔

۱۔ محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ ص ۱۷ سے ۲۰ تک از خضری۔

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۹۱ از شرح شیخ محمد عبدہ۔

۳۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۵ از شرح شیخ محمد عبدہ۔

ایک جگہ پر یوں فرمایا: "فالاحوال مضطربة، و الایدی مختلفة و الکثرة متفرقة فی بلاء ازل، و اطباق جهل، من بنات موؤدة، و اصنام معبودة، و ارحام مقطوعة، و غارات مشنونة". (۱) یعنی "ان کے حالات پراگندہ، ہاتھ الگ الگ تھے کثرت و جمعیت بٹی ہوئی، جانگداز مصیبتوں اور جہالت کی تہوں میں پڑے ہوئے تھے یوں کہ لڑکیاں زندہ درگور ہوتی تھیں، گھر گھر مورتیوں کی پوجا ہوتی تھی، رشتے ناطے توڑے جا چکے تھے اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا"۔

امیر المومنین کا کلام اس شخص کے مقابلے میں کہ جو تعصب کی بناء پر اس دوران میں جہالت و فساد کا انکار کرتا ہے ایک واضح و روشن دلیل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "مغیرہ بن شعبہ" نے "یزدگرد" سے مخاطب ہو کر یوں کہا تھا۔

"جہاں تک تم نے ہماری بدحالی کا ذکر کیا ہے تو اس وقت ہم سے زیادہ کوئی بدحال نہیں تھا اور ہماری بھوک کسی بھوک جیسی نہ تھی ہم گبریلے، بھنورے اور سانپ کھاتے تھے اور انہیں اپنی خوراک سمجھتے تھے۔ ہمارا گھر سطح زمین تھی اور ہمارا لباس اونٹ اور بھیڑ بکریوں کی اون سے ہی بنا ہوا ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کو قتل کرنا یا دوسروں پر تجاوز کرنا ہی ہمارا دین تھا اور ہم میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے تھے کہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹیاں ان کے طعام و خوراک سے استفادہ کریں لہذا وہ انہیں زندہ دفن کر دیتے تھے"۔ (۲)

ابن عباس نے بھی ان میں سے بعض امور کی طرف اشارہ کیا ہے جو طالب ہوں وہ ادھر رجوع کریں۔ (۳)

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۷ از شرح شیخ محمد عبدہ۔

۲۔ البدایہ و النہایہ ج۷ ص ۴۲ اور طبری ج۳ ص ۱۸

۳۔ مجمع الزوائد ج۸ ص ۲۳۷ نے طبرانی سے نقل کیا ہے اور حیاۃ الصحابہ ج۳ ص ۷۷۰ میں مجمع سے مروی ہے۔

عربوں کے علوم

امیرالمومنینؑ کے گزشتہ کلام سے اس وقت کے عربوں کے حالات اور ان کی علمی و ثقافتی سطح کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہالت و گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے اور یہ حقیقت "آلوسی" اور اس جیسے مورخین کے اس دعوے کی تکذیب کرتی ہے کہ (اسلام سے پہلے) عرب بعض علوم و فنون مثلاً نجوم، طب، قیافہ شناسی، ہوا شناسی اور پرندوں کی آواز و پرواز کے مطابق پیشگوئی اور آسمان شناسی وغیرہ کے لحاظ سے دوسری قوموں سے برتر تھے کیونکہ اس بارے میں جو کچھ وہ جانتے تھے وہ محض سادہ اور ابتدائی قسم کی معلومات تھیں جو زیادہ تر اندازے یا تخمینے پر مبنی ہوتی تھیں اور وہ بھی قبیلوں کے بڑے بوڑھوں یا بوڑھیوں سے ان تک پہنچی تھیں۔

ابن خلدون کی بھی یہی رائے ہے وہ کہتا ہے کہ علم طب کے بارے میں ان کی معلومات اتنی سادہ اور ابتدائی تھیں کہ انہیں نہ تو علم کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی شبیہ علم۔ اور یہی بات آسمان شناسی اور ستارہ شناسی کے بارے میں کہی گئی ہے جبکہ قیافہ شناسی اور پرندوں سے متعلق علوم تو بہت بعید ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں سے بعض امور تو علم کہلا ہی نہیں سکتے۔

ہماری اس بات کی تائید کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ لوگ ان پڑھ تھے اور سوائے چند محدود افراد کے باقی لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے قبیلہ بن بکر بن وائل کو خط بھیجا تھا تو اس پورے قبیلے میں کوئی ایسا شخص نہ تھا کہ جو اس خط کو پڑھ سکے۔ (۱)

۱۔ مجمع الزوائد ج ۵ ص ۳۰۵ اس کتاب کے مولف نے کہا ہے کہ اس کی روایات صحیح ہیں۔ اس نے احمد، بزار، ابی یعلی اور طبرانی (الصغیر) سے اور اس نے انس اور مرثد بن ظبیان سے نقل کیا ہے۔

"بلاذری" نے روایت کی ہے اور لکھا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت "قریش" (مکہ میں) سے سترہ افراد اور "اوس" و "خزرج" (مدینہ میں) سے فقط بارہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ (۱) ابن خلدون کی رائے تو یہ ہے کہ ان افراد میں سے بھی اکثر مہارت نہیں رکھتے تھے بلکہ نہایت ضعیف اور ابتدائی طور پر لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

بلکہ بسا اوقات اس زمانے کے لوگ لکھنے پڑھنے کو عیب سمجھتے تھے۔ "عیسیٰ بن عمر" کہتا ہے کہ "ذو الرمہ" نے مجھے کہا کہ اس حرف پر پیش ڈال دو تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟ تو اس نے فوراً علامت سکوت کے طور پر ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے سمجھایا کہ میرے اس کام کو پوشیدہ رکھنا کیونکہ ہمارے ہاں یہ عیب شمار ہوتا ہے۔ (۲)

یہ سب کچھ ان حالات میں تھا کہ قریش مقام و منزلت اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے حجاز میں سب سے بڑا قبیلہ تھا چونکہ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے اور اس پیشے کے لئے بہرحال پڑھا لکھا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی یہ حالت تھی۔ "اوس" اور "خزرج" ثقافت اور نفوذ (شہرت) کے اعتبار سے حجاز میں قریش کے بعد دوسرے مرتبے (درجے) پر شمار کئے جاتے تھے پس جب یہ اہم قبائل علمی لحاظ سے اس سطح پر ہوں تو ان پر یہود اور نصاریٰ (اگرچہ یہود سے کم تر) کا فکری تسلط ایک بدیہی امر ہے اور یہ بھی اعراب انہیں اس نگاہ سے دیکھیں جیسے شاگرد اپنے استاد کی طرف دیکھتا ہے۔ اس بارے میں انشاء اللہ ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

۱۔ دیکھئے فتوح البلدان طبع یورپ ص ۴۷۱ اور مابعد نیز صلاح الدین منجد کی تحقیق کے ساتھ چھپنے والے ایڈیشن کے حصہ سوم کا ص ۸۰۔ اگرچہ انہوں نے لکھنے پڑھنے والوں میں جن افراد کا ذکر کیا ہے (مثلاً حضرت عمر وغیرہ) تو ان میں سے بعض کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت عمر کے قبول اسلام کی بحث میں ذکر ہوگا کہ وہ پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے۔

۲۔ الشعر و الشعراء از ابن قتیبة ص ۳۳۳

اس کے علاوہ جو چیز یہاں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ان کا ان پڑھ ہونا ہی ان کی قوت حافظہ کے قوی ہونے کا راز تھا لیکن بعد میں "عصر کتابت" کے بعد سے کتابت پر زیادہ اعتماد کے تناسب سے ان کی یہ استعداد کم ہوتی چلی گئی۔

بعد میں انشاء اللہ ہم اس کی طرف اشارہ کریں گے کہ ناخواندگی کے خاتمے کے لئے اسلام کس قدر اہمیت کا قائل ہے یہاں تک کہ روایت ہے کہ جنگ بدر میں جب کفار کو قیدی بنا لیا گیا تو پیغمبر اکرمؐ نے ان کی رہائی کے لئے یہ فدیہ مقرر کیا کہ ہر اسیر دس مسلمان بچوں کو تعلیم دے۔ یاد رہے کہ جنگ بدر دعوت اسلام اور مشرکین سے جنگ کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے سب سے مشکل اور حساس مرحلہ تھا۔ اس بارے میں ہم جنگ بدر اور کچھ "احد" کے بارے میں بحث کے اواخر میں بیان کریں گے۔

مختصر یہ کہ اس وقت (قبل از اسلام) ہر طرف جہالت کا دور دورہ تھا اور اسلام سے پہلے کہیں بھی فکری ارتقاء کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی بلکہ اس کے برعکس اکثر جہالت، گمراہی اور ہلاکت ہی کے آثار نظر آتے ہیں۔

عربوں کی خصوصیات

اسلام سے پہلے بعض خصوصیات اور اوصاف کی وجہ سے عرب دوسروں سے ممتاز تھے اور انہی اوصاف کی بنا پر لوگ ان کی مدح کیا کرتے تھے البتہ یہ اچھی صفات ان کی بری عادات کے مقابلے میں بہت کم تھیں لیکن جب ہم انہی کم اچھی صفات کو "دقیق" نظر سے دیکھتے ہیں تو ان میں بھی کوئی قابل تعریف چیز نظر نہیں آتی بلکہ اکثر موارد میں نتیجہ برعکس ہی نکلتا ہے کیونکہ ہر کام کی حقیقی قدر و قیمت اس کے محرکات، وسائل اور عزائم سے وابستہ ہوتی ہے جبکہ اسلام سے پہلے عربوں سے منسوب امور میں ہمیں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی جو ان کی تعریف و تمجید یا مدح و ثنا کا باعث بن سکے نہ تو وسائل اور محرکات کے لحاظ سے اور نہ ہی اہداف و مقاصد کے نقطہ نظر سے۔

عربوں کے امتیازات

ا۔ فیاضی اور مہمان نوازی

یہی وہ تنہا چیز ہے کہ جسے ابو سفیان نے اپنے دین کی درستی کی دلیل کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس نے "کعب ابن اشرف" سے کہا کہ خدا کی نظر میں کیا ہمارا دین بہتر ہے یا "محمدؐ" اور اس کے اصحاب کا دین؟ ہم میں سے کون تیرے خیال میں زیادہ ہدایت یافتہ اور حق کے نزدیک تر ہے؟ جبکہ ہم بلند کوہانوں والے اونٹوں کی قربانی دیتے ہیں اور پانی کے ساتھ دودھ سے لوگوں کی پذیرائی کرتے ہیں اور جب شمالی ہوائیں چلنے سے گرمی میں شدت آتی ہے تو ہم لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں ابن اشرف نے جواب دیا کہ "تم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو"۔

لیکن ان کی یہ خصلت کوئی حقیقی فضیلت و برتری شمار نہیں ہوتی کیونکہ ان کی یہ سخاوت نہ تو خدا پر ایمان کی وجہ سے تھی اور نہ ہی ان انسانی عواطف کی وجہ سے تھی جن کی بناء پر انسان دوسروں کو محتاج دیکھ کر متاثر ہوتا ہے اور بغیر سوال یا کسی اور وجہ کے فقط ہمدردی کے تحت بخشش عطا کرتا ہے۔ نہ فقط یہ بلکہ اس کے برعکس انہیں اس عمل پر ابھارنے والے عوامل غیر انسانی ہوا کرتے تھے اور وہ یہ کہ بدنامی کے عار سے محفوظ رہیں اور شعرا کی ہجو و بدگوئی سے اپنے آپ کو بچائیں تاکہ وہ کنجوسی اور بخل کی وجہ سے شہروں میں بدنام نہ ہو اور ان کی عزت، آبرو اور احترام کو کوئی گزند نہ پہنچے یا پھر یہ کہ ان کا نام اچھے اوصاف کے ساتھ لیا جائے اور ہمیشہ ان کی تعریف کی جائے یا قبیلے کی سربراہی و سرداری کا حصول مدنظر ہوتا تھا یا اپنے حریف پر برتری جتانا مقصود ہوا کرتا تھا۔ اس بات پر تاریخی شواہد بہت زیادہ ہیں اگرچہ بعض استثنائی موارد اس کے برعکس بھی ہیں کہ جو شاذ و نادر ہونے کی وجہ سے قابل توجہ نہیں ہیں۔

یاد رہے کہ بدو اعراب کا سامنا چونکہ نہایت طاقتور اور بے رحم فطرت (جو صحرا کی طبیعت میں شامل ہے) سے ہوا کرتا تھا اور وہ اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو ناتوان پاتے تھے لہذا ان میں مہمان نوازی اور فیاضی کی ضرورت کا شعور پیدا ہونا فطری بات تھی۔ کیونکہ صحرائی سفر دشوار اور سخت ہونے کے علاوہ دسیوں دن طول پکڑتے تھے اور سفر میں مطلوب کافی غذائی مواد اٹھانا ممکن نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ قومی غیرت و تعصب

یہ درحقیقت ایک مذموم اور بری صفت تھی کیونکہ وہ صرف اپنے قبیلے کے افراد یا رشتہ داروں کی حمایت اور مدد کیا کرتے تھے چاہے وہ ظالم ہوتے یا مظلوم۔ قرآن پاک ان کی اس خصلت کو "حمیة الجاهلیة" یا جاہلانہ تعصب سے تعبیر کرتے ہوئے اس کی مذمت کرتا ہے کیونکہ اس تعصب اور غیرت کی وجہ جہالت اور نادانی ہے اور یہ حماقت جلد بازی کا نتیجہ ہے اس خصلت کی پیدائش کی وجہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

۳۔ شجاعت

یہ صفت اپنے مختلف موارد میں استعمال کے اہداف کے لحاظ سے مستحق مدح یا مورد مذمت قرار پاتی ہے جہاں یہ اچھے موارد میں ظاہر ہو وہاں یہ قابل ستائش ہے ورنہ دیگر مواقع پر یہ باعث مذمت ہے اسی لئے اگرچہ شیر سے زیادہ شجاع کوئی نہیں لیکن یہ صفت اس کے لئے کوئی فضیلت شمار نہیں ہوتی۔

جب ہم اس مسئلے کی گہرائی میں جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس وقت عربوں میں شجاعت کا راز یہ تھا کہ وہ ایسے صحرائی ماحول میں زندگی بسر کیا کرتے تھے کہ جو قدرتی پناہگاہوں اور رکاوٹوں وغیرہ سے خالی ہوتا تھا۔ جہاں ہر کوئی جانتا تھا کہ وہ خود ہی اپنی ذات کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور تلوار یا زور بازو کے علاوہ کوئی چیز اسے نہیں بچا سکتی خصوصاً

جب ہر لحہ جنگ اور لوٹ مار اور انتقام کا خطرہ سامنے ہو۔ ان حالات میں جو بھی شجاع اور نڈر نہ ہوتا وہ دوسروں کا لقمہ بن جاتا تھا یا کم از کم خود شکار نہیں کر پاتا تھا گویا یہی ان لوگوں کی منطق تھی کہ "اگر بھیڑیے نہ ہو تو دوسرے بھیڑیے تمہیں نگل جائیں گے" اور اس کے باوجود بھی کیا بھیڑیے کی درندگی میں اس کی شجاعت کی تعریف کی جا سکتی ہے؟

۴۔ جرات اور قوت فیصلہ

اس بارے میں گفتگو شجاعت والی گفتگو سے مختلف نہیں ہے بلکہ اسی سے مربوط بحث ہے۔ یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ بدو عربوں کی یہ خصلت اپنے اعمال کے مقابلے میں غیر ذمہ داری کے احساس کی وجہ سے تھی کیونکہ وہ قبیلے کی طرف سے مورد حمایت قرار پاتے تھے چاہے وہ ظالم ہوتے یا مظلوم۔

اس کی دوسری وجہ بیابانوں میں زندگی تھی کہ جہاں اچانک جنگ یا انتقامی قتل کا خطرہ ہمیشہ ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا اور یہی چیز سرعت عمل کا تقاضا کرتی تھی اس کے علاوہ تمام حوادث کے مقابلے میں احساس ذمہ داری کے فقدان نے بھی فوری ردعمل دکھانے کو ان کی نمایاں خصوصیت بنا دیا تھا (یا سرکشی کو جنم دیا تھا)۔

انتقام میں جلد بازی ان میں ایک خاص حساسیت کا موجب بنتی تھی جس کی وجہ سے ان میں کبھی بھی حلیم اور بردبار انسان نہیں ملتے تھے سوائے ان عمر رسیدہ اور نادر افراد کے جو یا تو عالی ہمت ہوتے تھے یا ڈرپوک۔

۵۔ عزت نفس، نفس پر توجہ، آزادی پسندی، قوت ارادی

کلام میں فصاحت و بلاغت اور ہمسائے کے حقوق جیسی چیزیں بھی کسی نہ کسی طرح گذشتہ موارد سے ہی مربوط ہیں لہذا ان سے بحث کرتے ہوئے بھی ان کے اہداف اور مقاصد کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ گذشتہ وجوہات کے علاوہ ان صفات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ

اس زمانے میں خانہ بدوش عرب کسی ایسی مرکزی حکومت کے تابع نہ تھے۔ جو ان پر تسلط جمانے یا کسی نظام کو ٹھونسنے کی کوشش کرتی اگرچہ جبر و تذلیل کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔ نتیجتاً وہ اپنے قول و عمل اور اقدامات وغیرہ میں آزاد ہوتے تھے۔

۶۔ ایفائے عہد

یہ بذات خود ایک اچھی صفت تھی سوائے ان موارد کے کہ جن میں یہ عہد ناسے معاشرے کے لئے مضر ہوتے تھے البتہ صحرائی زندگی، اپنی خاص صفات کے ساتھ کہ جن کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے ایسی ہی صفت کا تقاضا کرتی تھی۔

گذشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ صفات کو اخلاق اور انسانی فضائل و اقدار میں سے شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ یہ صفات، اچھے اخلاق، انسانیت، تقویٰ اور دینی شعور کی بنیاد پر ظہور میں آتی ہوں بلکہ اس کے برعکس ان کی بنیادیں بیشتر اوقات ناپسندیدہ ہوتی تھی۔

اسلام اور مذکورہ صفات

اسلام نے کوشش کی کہ ان صفات کو ان کے صحیح راستے پر لے آئے اور انہیں انسانی اقدار، حقیقی عواطف اور اخلاقی فضائل کی بنیاد فراہم کرے خصوصاً صحیح دینی جذبات کو ایک امت کی تشکیل کے لئے بروئے کار لائے اور ان صفات میں سے جو اس قابل نہ ہوتی کہ اسے باقی رکھا جاتا اسے حکمت اور اچھے وعظ و نصیحت کے ذریعے ختم کرنے کے لئے اقدام کیا مثلاً اسلام نے بذل مال اور جود و کرم کو انسانی جذبوں اور محتاجوں کی ضروریات کے احساس کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جیساکہ بہت سی نصوص سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے جبکہ اللہ کی طرف سے اجر اور مغفرت کی خواہش اس پر مستزاد ہے اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا صریح فرمان ہے:

"و یطعمون الطعام علی حبه مسکیناً و یتیماً و اسیراً انما نطعمکم لوجه اللّٰه لا نرید منکم جزآءً و لا شکوراً". (۱)

"اور وہ مسکین، یتیم اور اسیر کو محبت خدا میں کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تمہیں فقط خدا کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کسی جزا اور شکریہ کی تمنا نہیں رکھتے"۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے کی تعریف کی ہے اور اس کی مدح میں فرماتا ہے:

"و یؤثرون علی انفسھم و لو کان بھم خصاصۃ". (۲)

"اور وہ دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم کرتے ہیں اگرچہ خود تنگدست ہوں"۔

اور قبائلی تعصبات کا رخ موڑ کر انہیں تعمیری رخ پر لگانے اور اس کے تمام شر انگیز اور انحرافی عناصر کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی پس اس نے ماں باپ سے نیکی اور صلہ رحمی کی دعوت دی اور اسے واجبات میں سے قرار دیا۔ واضح ہے کہ یہ امر معاشرے میں انسانوں کے باہمی ربط کو تقویت عطا کرتا ہے جبکہ اس نے ناحق تعصبات پر ضرب لگائی اور انہیں جاہلیت کے مظاہر میں سے گردانتے ہوئے اس پر سزا مقرر کی۔ اس کے بارے میں بعض صریح نصوص موجود ہیں جن کی طرف ہم سیرت نبویؐ میں اشارہ کریں گے۔

اسی طرح سے اسلام نے سخت مزاجی و قساوت کو دین و انسانیت کی بھلائی کے راستے پر لگا دیا اور حق و خیر کے لئے اسے ثمر بخش اور محافظ بنا دیا۔ اس امر پر دلالت کرنے والی نصوص بہت زیادہ ہیں ہم فقط چند آیات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

"اشداء علی الکفار رحماء بینھم". (۳)

"وہ کافروں پر بڑے سخت ہیں اور آپس میں مہربان"۔

۱۔ سورہ دھر، آیت ۸ و ۹

۲۔ سورہ حشر، آیت ۹

۳۔ سورہ فتح، آیت ۲۹

نیز فرمایا:

"یا ایہا النبی جاهد الکفار و المنافقین و اغلظ علیہم". (۱)

"اے نبی! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کرو اور ان پر سختی کرو"۔

اور اسی طرح فرمایا:

"و قاتلوا الذین یلونکم من الکفار و لیجدوا فیکم غلظۃ". (۲)

"جو کافر تمہارے نزدیک ہیں ان سے جنگ کریں چاہیے کہ وہ تم میں سختی دیکھیں"۔

اس سلسلے میں بہت سی آیات و روایات ہیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ سخت گیری کی صفت سے ظلم و انحراف کے خاتمے اور حق پر قائم رہنے کے لئے کام لیا جائے۔ اللہ کے راستے میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے وہ چاہتا ہے کہ یہ سختی مومنین کے مابین رحمت، مہربانی اور سلامتی میں بدل جائے۔ مذکورہ صفات کے بارے میں نصوص قرآن، احادیث رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اور اقوال معصومین علیہم السلام کی طرف رجوع کیا جائے تو کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اسلام نے اپنی پوری کوشش کی کہ انسان کی پسندیدہ صفات کو امور خیر کی طرف بڑھائے کہ جن میں دین اور امت کی بھلائی ہے اور ان مذموم صفات کا قلع قمع کر دے کہ جو انسانی سعادت اور حق کی بلند عمارت کے لئے ہولناک اور تباہ کن ہیں۔

۱۔ سورہ توبہ، آیت ۷۳

۲۔ سورہ توبہ، آیت ۱۲۳

بنائے مکہ کی تاریخ

وہ سرزمین کہ جو "ام القری" کے لقب کی بجا طور پر حامل ہوگئی، کی بناء پر توسیع کی دقیق تاریخ ہم بیان نہیں کر سکتے ظاہراً مکہ کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں تاسیس کعبہ سے پہلے ہوئی جیساکہ بعض روایات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے نیز قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول بھی اسی امر کی حکایت کرتا ہے: "رب اجعل هذا البلد آمنا". (سورہ ابراہیم / ۳۵) یعنی اے میرے پروردگار اس شہر کو مقام امن قرار دے۔

لہذا بعض لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں کہ "قصیَّ" وہ پہلا شخص ہے کہ جس نے مکہ کی بنیاد رکھی اور قبل ازیں بیت اللہ صحرا میں تنہا تھا خصوصاً زیارات کے وقت۔ اس کی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ "قصیَّ" کو "مُجَمِّع" کہا جاتا ہے کیونکہ اسی نے اطراف کعبہ میں قبائل کو جمع کیا۔ اس امر کو ان کے ادعا پر دلیل نہیں مانا جاسکتا کیونکہ "قصیَّ" سے قبل تاریخ مکہ کا وجود اس امر پر بہترین شاہد ہے کہ اس سے قبل بھی وہاں پر آبادی موجود تھی، لوگ بستے تھے اور یہ بستی معروف و مشہور تھی تاہم ممکن ہے "قصیَّ" نے ساکن قبائل کو مکہ میں مناسب طور پر منظم کیا ہو۔

بہرحال تاریخ مکہ کچھ بھی ہو ہمارے لئے یہ امر زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جو چیز ہمیں جاننا چاہیے وہ مکہ کا دینی مقام اور اس سے عرب و غیر عرب قبائل کا ارتباط ہے اس کے بارے میں گفتگو مکہ میں موجود بیت عتیق کے بارے میں گفتگو سے جدا نہیں ہیں اسی طرح سے قریش (جسے اس بیت عتیق کی خدمت کا شرف حاصل تھا) کے بارے میں گفتگو سے بھی جدا نہیں۔ اس سلسلے میں ہم چند نکات کا ذکر کرتے ہیں۔

الف۔ تاسیس کعبہ

کعبہ ہی وہ پہلا گھر ہے جو مکہ میں انسانوں کے لئے بنایا گیا یہ گھر بابرکت ہے اور عالمین کے لئے ہدایت ہے جیساکہ قرآن نے تصریح کی ہے معروف اور مشہور یہ ہے کہ اس کے بانی شیخ الانبیاء حضرت ابراہیمؑ ہیں لیکن حضرت امیر المومنین علیؑ کے اقوال میں ایسے شواہد موجود ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ خانہ خدا ابو البشر حضرت آدمؑ کے زمانے سے تھا البتہ حضرت ابراہیمؑ نے اس کی بنیادوں کو بلند کیا نیز اس کی عمارت اور دیواروں کو سنوارا تھا۔ حضرت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"الاترون ان الله سبحانه اختبر الاولین من لدن آدم صلوات الله علیه، و الی الاخرین من هذا العالم باحجار لاتضر و لاتنفع، و لاتبصر و لاتسمع، فجعلها بیته الحرام (الذی جعله للناس قیاما). ثم وضعه باوعر بقاع الارض حجراً، و اقل نتائق الدنیا مدراً، و اضیق بطون الاودیة قطرا، بین جبال خشنه، و رمال دمثة، و عیون وشلة، و قری منقطعه لایزکو بها خف، و لاحافر و لاظلف. ثم امر آدم و ولده: ان یثنوا اعطا فهم نحوه، فصار مثابة لمنتجع اسفارهم، و غایة لملقی رحالهم، تهوی الیه الافئدة من مفاوز سحیقة الخ". (۱)

یعنی "کیا تم لوگ مشاہدہ نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے زمانے کے لوگوں سے لے کر آخری زمانے تک کے لوگوں کو آزمایا ہے ان پتھروں کے ذریعے جو (بذات خود) نہ مضر ہیں نہ مفید نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ پس اس نے انہی پتھروں کو بیت الحرام اور لوگوں کے لئے باعث قیام اور اسے دنیا کے سب سے زیادہ ناہموار پتھریلے اور دشوار گزار بے خاک اور سب سے زیادہ تنگ وادی میں قرار دیا، کھردرے پہاڑوں، نرم ریتلی زمین اور کم پانی چشموں کے درمیان"۔

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ قاصعہ نمبر ۱۸۷ (شرح محمد عبدہ)

اسی طرح ایسی سنی و شیعہ روایات ہیں کہ جو اس مدعیٰ پر دلالت کرتی ہیں جو صاحب چاہیں ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ (۱)

ظاہراً قرآن بھی اس امر کا مخالف نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کی طرف خانہ خدا کی تعمیر نو کی نسبت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"و اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت". (۲)

اور جب ابراہیمؑ البیت کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

یہ الفاظ اس بات کے منافی نہیں ہیں کہ عمارت کی بنیادیں پہلے سے موجود ہوں اور ابراہیمؑ نے ان بنیادوں کو بلند کیا ہو اور اس کی دیواروں میں کچھ تبدیلی کی ہو۔ یہ موضوع زیادہ بحث و تحقیق کا محتاج ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم کسی اور موقع پر انشاء اللہ اس کا حق ادا کر سکیں۔

ب۔ ابراہیمؑ کی دعا

بہرحال جب ابراہیمؑ نے ملاحظہ کیا کہ جس گھر کے ذریعے اللہ انسانوں کو آزماتا ہے وہ ایسی جگہ پر واقع ہے کہ جہاں زندگی بسر کرنا مشکل اور طاقت فرسا ہے جیسا کہ قبل ازیں امیر المومنینؑ کا کلام بھی گزر چکا ہے لہذا انہوں نے اپنے پروردگار کو یوں پکارا:

"رب انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرع، عند بیتک المحرم، ربنا لیقیموا الصلاۃ، فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم، و ارزقھم من الثمرات، لعلھم یشکرون". (۳)

۱۔ مثال کے طور پر آپ ان کتب کیطرف رجوع کرسکتے ہیں۔ تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۱۲۹-۱۲۶ الطبری، الدرالمنثور، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید و غیرہ۔

۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۲۷

۳۔ سورہ ابراہیم، آیت ۳۷

یعنی اے میرے پالنے والے میں نے تیرے معزز گھر کے پاس ایک بنجر وادی میں اپنی کچھ اولاد کو بسایا تاکہ اے ہمارے پالنے والے یہ لوگ یہاں پر نماز پڑھا کریں۔ پس تو بعض لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر اور انہیں مختلف پھلوں سے روزی عطا کر تاکہ یہ لوگ تیرا شکر ادا کریں۔

بیشک ابراہیمؑ کی دعا قبول ہوگئی اور مکہ صاحبان آرزو کا قبلہ ہوگیا اور برگزیدگان عالم کے قلوب کا مرکز بن گیا۔

ج۔ کعبہ کا احترام

کعبہ تمام امتوں کے نزدیک مقدس و معظم رہا ہے لہذا علامہ طباطبائیؒ ایدہ اللہ (اللہ ان کی دستگیری کرے) فرماتے ہیں۔ (۱) "ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ "سیوا" کی روح کہ جو ان کے نزدیک "اقنوم سوم" ہے حجر اسود میں حلول کر گئی جبکہ وہ اور اس کی زوجہ بلاد حجاز کی زیارت کر رہے تھے"۔

فارس کے صابئین اور کلدانی کعبہ کو سات محترم گھروں میں سے ایک گھر شمار کرتے ہیں (۲) اور بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ زحل کا گھر ہے کیونکہ یہ گھر بہت پرانا ہے اور اسے طویل زمانہ گزر چکا ہے۔

۱۔ جس وقت یہ سطور لکھی جا رہی تھیں مفسر قرآن علامہ محمد حسین طباطبائی اعلی اللہ تعالی مقامہ بقید حیات تھے۔ (مترجم)

۲۔ سات گھر یہ ہیں: کعبہ، مارس (اصفہان میں ایک پہاڑ کے اوپر)، مندوستان (ملک ہند میں)، نوبہار (شہر بلخ میں)، بیت غمدان (شہر صنعاء میں)، کاوسان (خراسان کے شہر فرغانۃ میں) اور وہ گھر جو چین کے بلند علاقوں میں موجود ہے۔

یہودی بھی کعبہ کی تعظیم کرتے تھے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس میں دین ابراہیمؑ کے مطابق اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کعبے میں مجسمے اور تصاویر موجود تھیں، ان میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے مجسمے بھی تھے جو اپنے ہاتھوں میں تیر پکڑے ہوئے تھے نیز وہاں پر عذرا (جناب مریم) اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر بھی تھیں۔ عیسائیوں کا بھی، یہودیوں کی طرح کعبہ کی تعظیم کرنا اسی امر کا گواہ ہے۔ عرب والے بھی اس کا نہایت احترام کرتے تھے وہ اسے اللہ تعالیٰ کا گھر شمار کرتے تھے اور اطراف و اکناف سے اس کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ (۱)

یہ تو تھی بات علامہ طباطبائیؒ کی لیکن اس کے کچھ حصہ کے لئے معتبر تاریخی سند کی ضرورت ہے۔

بنابریں کعبہ تمام قوموں اور گروہوں کے لئے محترم تھا خصوصاً طویل دور جاہلیت کے عربوں کی نظر میں بہت قابل احترام تھا اور اس کی تعظیم عربوں کی نظر میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ اسے اپنے لئے سرچشمہ عزت اور منزل آرزو سمجھتے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ دیکھتے تھے کہ دوسری قومیں انہیں اس کے باعث بغض و حسد کی نظر سے دیکھتی تھیں اور ان سے یہ شرف چھیننے کے درپے ہیں یا کم از کم وہ اس کی اہمیت کو کم کر دینا چاہتی تھیں۔

۱۔ "غساسنۃ" نے "حیرہ" میں کعبہ کے مقابلے میں ایک گھر بنایا۔ (۲)

۲۔ نجران میں بھی اس کے مقابلے کے لئے ایک اور کعبہ بنایا گیا۔ "اعشیٰ" کہتا ہے:

و کعبۃ نجران حتم علیک

حتی تناخی باعتابہا

۱۔ المیزان ج۳ ص ۳۶۲-۳۶۱

۲۔ حیات محمد از محمد حسین ہیکل ص ۶۳

ب "(اے ناقہ) تیرے لئے کعبہ نجران تک جانا ضروری ہے تاکہ اپنا وزن تو اس کے آستان پر اتارے"۔

کعبہ نجران کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایک کلیسا تھا جسے عبد المدان بن الدیان الحارثی کی اولاد نے کعبہ کی مانند بنایا تھا، کعبہ کی طرح اس کا احترام کرتے تھے اور اس کا نام انھوں نے کعبہ نجران رکھا تھا۔ (۱)

۲۔ شام میں بھی ایک کعبہ شامیہ تھا۔ (۲)

۳۔ اور یمن میں کعبہ یمانی تھا۔ (۳)

اس بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ "ابرھہ بن اشرم" نے یمن میں ایک گھر بنایا تھا اس نے لوگوں کو اس کی تعظیم کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ وہ اس کا حج کیا کریں اس نے اس کی بہت تزئین و آرائش کی، عمدہ ترین چیزیں اس کے لئے مہیا کیں، ممکنہ حد تک بہترین قالین بچھائے لیکن اس کے باوجود وہ اہل مکہ کو تو ایک طرف، اہل یمن کو بھی کعبہ کی طرف جانے سے نہ روک سکا۔ لوگ اسی طرح کعبہ کا حج کرتے رہے یہاں تک کہ "بنی کنانہ" کے ایک شخص نے ابرھہ کے عبادت خانے میں جسارت کی اور وہاں پر پاخانہ کر دیا۔ ابرھہ کو غصہ آگیا اور عام الفیل (ہاتھی کا سال - یعنی جس سال اس نے مکہ پر چڑھائی کی) میں فوج لے کر مکہ جا پہنچا، وہاں حضرت عبدالمطلب سے کہا کہ میں فقط خانہ کعبہ کو منہدم کرنا چاہتا ہوں، حضرت عبدالمطلب نے انہیں جواب دیا کہ اس گھر کا مالک خود اس کی حفاظت کرے گا پھر ابرھہ اور اس کے لشکر پر جو گزری قرآن کے الفاظ میں:

"الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل ا لم یجعل کیدھم فی تضلیل۔ و ارسل علیہم طیراً ابابیل۔ ترمیہم بحجارۃ من سجیل۔ فجعلہم کعصف ماکول" (سورہ فیل)

۱۔ معجم البلدان از یاقوت الحموی ج ۵ ص ۲۶۸

۲-۳۔ البدایہ و النہایہ ج ۲ ص ۱۹۲

یعنی (اے رسول) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر پر پانی نہیں پھیرا اور اس نے ان پر ابابیل کے جھنڈ بھیجے جو ان پر کھرنجوں کی کنکریاں پھینکتی تھی یوں اس نے انہیں چبائے ہوئے بھس کی طرح کر ڈالا۔

کہتے ہیں کہ ابرھہ سے پہلے "تبع بن حسان" نے بھی کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ کعبہ کے پتھروں کو یمن لے جائے گا اور ان سے وہاں پر ایک گھر بنائے گا تاکہ عرب اس کا احترام کریں لیکن اللہ نے اپنے گھر سے اس کے شر اور سازش کو دور رکھا۔ (۱)

کعبہ اور بت

کہتے ہیں عمرو بن لحی جو قبیلہ خزاعہ کا بزرگ تھا جب خانہ کعبہ کا متولی ہوا تو اس نے شام کا سفر کیا اور وہاں سے "ھبل" نامی بت اپنے ہمراہ لے آیا اور اسے کعبہ پر رکھ دیا۔ کعبہ پر رکھا جانے والا یہ پہلا بت تھا۔ بعد ازاں مزید بت لے آیا۔ شحنہ بن خلف الجرھمی کہتا ہے:

یا عمرو انک قد احدثت الهة
شتی بمکة حول البیت انصابا

و کان للبیت رباً واحداً ابداً
فقد جعلت لہ فی الناس اربابا

"اے عمرو تو نے پہلی بار مکہ میں بتوں کو اطرافِ کعبہ میں نصب کر دیا، خانہ کعبہ کا ہمیشہ ایک خدا تھا لیکن تو نے انسانوں میں اس کے بہت سے رب بنا دیئے"۔

۱۔ ثمرات الاوراق، ص ۲۸۷

عمرو بن لحی کے بارے میں کہتے ہیں کہ: "اس کی شرافت و بزرگواری اور مہربانیوں کی وجہ سے لوگوں میں اس کی بات حکم شریعت کی طرح مانی جاتی تھی"۔ (۱)

اس کے بعد عربوں میں بت پرستی رواج پا گئی یہاں تک کہ ہر قبیلے نے کعبہ میں اپنے لئے ایک بت رکھ دیا (جس کی زیارت کے لئے وہ تمام علاقوں سے آتے تھے) یہاں تک کہ ان کی تعداد تین سو سے زیادہ ہو گئی بعض لوگ اپنا بت کسی اور مناسب جگہ پر رکھتے پھر جب وہ حج پر آتے تو اس کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کرتے اور پھر لبیک کہتے ہوئے مکہ جا پہنچتے تھے۔ (۲)

ہر گھر والوں نے ایک بت بنا رکھا تھا جس کی وہ اپنے گھر میں عبادت کرتے تھے جب کوئی شخص سفر پر جانے لگتا تو تبرک کی خاطر اپنے آپ کو اس سے مس کرتا اور واپسی پر اپنے گھر والوں سے ملنے سے پہلے بت کے پاس جاکر اسے چھوتا تھا۔

یہ بات اس قول کے لئے شاہد ہے کہ عمرو بن لحی سے پہلے عرب بت پرست نہ تھے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسماعیل مکہ چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔ یہاں تک ان کی تعداد زیادہ ہو گئی اور وہ اردگرد کے شہروں کی طرف کوچ پر مجبور ہو گئے ان مواقع پر ان میں سے ہر کوئی حرم کا ایک پتھر تعظیم کی خاطر لے گیا پھر وہ کعبہ کی طرح اس کے گرد طواف کرتے اور عبادت بجا لاتے تھے یہ طرز عمل پتھروں کی پوجا کا باعث بن گیا۔ یوں بعد کی نسلیں پہلوں کے دین (یعنی دین اسماعیل) کو بھول گئیں اور بتوں کی پوجا کرنے لگیں۔ (۳)

۱۔ البدایہ و النہایہ ج ۲ ص ۱۸۷

۲۔ تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۵۵

۳۔ البدایہ و النہایہ ج ۲ ص ۱۸۸ ، المستطرف ج ۲ ص ۷۵ نے ابن اسحاق اور دوسروں سے نقل کیا ہے۔

اور ہم اسی دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں لیکن عمرو بن لحی ہی ظاہراً وہ پہلا شخص تھا کہ جس نے کعبہ پر بت رکھا اور دوسروں نے اس کی پیروی کی۔ شام سے اس کا بت لے کر آنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس سے قبل بتوں سے آشنائی تھی اور انہیں احترام حاصل تھا اگرچہ ہم یہ نہ کہیں کہ وہ سفر شام سے پہلے بت پرست تھا۔

بہرحال یہاں جو بات ہماری نظر میں اہم ہے وہ ہے اس زمانے میں دیگر لوگوں کے علاوہ عربوں کی نظر میں کعبہ کی حیثیت خواہ ان دنوں جبکہ وہ بتوں کو پوجتے اور ان کا احترام کرتے تھے یا ان ایام میں جبکہ ان کے بے حیثیت ہونے اور ان کی پوجا کے نامعقول ہونے پر آگاہ ہوگئے تھے۔

تولیت کعبہ

تولیت کعبہ پہلے اولاد اسماعیل کے پاس تھی پھر یہ جرہمیوں (۱) کے ہاتھ آگئی کہ جو رشتے میں اولاد اسماعیل کے ماموں لگتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بعد کعبہ کی تولیت "عمالیق" کے ہاتھ آگئی، بعد میں پھر جرہمیوں کی طرف لوٹ گئی اور جب اولاد اسماعیل زیادہ ہوگئی اور اس نے خاصی طاقت حاصل کر لی تو اپنے قبیلے کے سردار "خزاعۃ" کی قیادت میں اس نے قیام کیا اور جرہمیوں سے تولیت کعبہ واپس لے لی یہ تولیت اولاد خزاعۃ میں ہی رہی یہاں تک کہ "قصیّ" بن کلاب" نے ان سے چھین لی۔ قصیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد ہجم تھے۔

یہ تولیت "حلیل خزاعی" کے پاس تھی جو "قصیّ" کے سُسر تھے۔ اس نے اسے اپنی موت کے بعد اپنی بیٹی زوجہ قصیّ کے نام کر دیا تاہم خانہ خدا کی کلید "ابو غبشان" کو سونپ دی۔ قصیّ نے ایک مشک شراب کے بدلے یہ کلید اس سے خرید لی اس کا یہ کام

۱۔ البدایہ و النہایہ ج۲ ص ۲۱۰ الخ

معروف ضرب المثل بن گیا: "اخسر من صفقة ابی غبشان" یعنی فلاں کا خسارہ ابو غبشان کے سودے سے بھی زیادہ ہے۔ یہ اشعار بھی اسی واقعہ سے متعلق ہیں:

ابو غبشان اظلم من قصی

و اظلم من بنی فهر خزاعه

فلا تلحو قصیاً فی شراه

و لوموا شیخکم اذ کان باعه (۱)

۔ ابو غبشان قُصیؒ سے زیادہ ظالم تھا اور خزاعہ، بنی فہر سے زیادہ ظالم تھا پس اس خریداری میں قصیؒ کو دشنام نہ دو بلکہ اپنے بزرگ کو ملامت کرو جس نے اسے بیچا۔

کہتے ہیں کہ اسی بناء پر خزاعہ اور قریش کے مابین جنگ چھڑ گئی قریش فتح یاب ہوگئے کہ جو فہر بن مالک کی اولاد میں سے تھے۔ (۲) البتہ اس بارے میں اور نظریے بھی ہیں بعض کا کہنا ہے کہ قصی نے خزاعہ کے ساتھ جنگ کر کے کعبہ کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ آخر کار فیصلہ "عمرو بن عوف" کے سپرد ہوا جس نے قصی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ (۳) اس سلسلے میں ایک اور رائے بھی ہے اور وہ یہ کہ "حلیل" نے مرتے وقت تولیت کعبہ کی وصیت اپنے داماد قصی کے حق میں کر دی اور خزاعہ کا بھی یہی خیال تھا۔ (۴) جب خزاعہ کا خود بھی یہ کہنا تھا تو پھر ان کے درمیان جنگوں کی وجہ سوائے حسد اور سرکشی کے کیا ہوسکتی ہے؟

۱۔ تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۴۰ اور البدایہ و النہایہ ج ۲ ص ۲۰۶ از ابن اسحاق

۲۔ تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۳۹ اور البدایہ و النہایہ ج ۲ ص ۲۰۵ از ابن اسحاق

۳۔ تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۳۹

۴۔ اس قول کے بعض مدارک کا ذکر ہم بعد میں کریں گے انشاء اللہ تعالی۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "حلیل" نے قصی کے حق میں تولیت کی وصیت کر دی لیکن بنی خزاعہ نے ظلم اور حسد کی وجہ سے جنگ بھڑکا دی۔ بعد ازاں وہ عمر بن عوف کو ثالث بنانے پر راضی ہوگئے اس نے بھی قصی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور شاید عمر بن عوف کا فیصلہ بھی قصی کے حق میں وصیت حلیل کی تائید کرتا ہے یا اسے اس امر کی اطلاع تھی البتہ اگر حقانیت قصی پر دیگر دلائل نہ ہوں۔

بہرحال قصی نے قبل از ہجرت دوسری صدی میں خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی۔ اس نے کعبہ کے ساتھ "دارالندوہ" بنایا یہ قریش کی حکومت، قضاوت اور مشورت کی جگہ تھی اس کا شمار قصی کے عظیم آثار میں سے ہوتا ہے اور یہ اس کی فہم و فراست اور حکمت و دور اندیشی کی علامت ہے۔

قریش کا مرتبہ

واضح ہے کہ "بیت عتیق" (خانہ کعبہ) کی رکھوالی کا مرتبہ کہ جو ہر انسان کے لئے باعث عظمت ہے قریش کو حاصل تھا پھر وہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی نسل سے بھی تھے لہذا ایسا احترام انہیں حاصل ہونا ایک طبیعی امر تھا جبکہ اس زمانے میں کسی کے شرف و عزت کو ناپنے کے لئے نسب ایک انتہائی اہم پیمانہ تھا۔ قریش کے احترام کی ایک اور وجہ "حنیفیت" سے ان کی قربت تھی کہ جو عربوں میں ایک محترم و مقدس دین سمجھا جاتا تھا یہ اور دیگر امور قریش کی عزت و تکریم، مقام و مرتبہ اور اثر و نفوذ کا باعث تھے اور ان کی وجہ سے لوگ انہیں احترام اور تقدس کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں یہاں پر ہم "قصی" کا قول نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں انہوں نے قریش سے خطاب کرتے ہوئے کہا "حج کا موقع آ پہنچا ہے جو کچھ تم نے انجام دیا ہے عربوں نے اس کے بارے میں سن لیا ہے جبکہ عرب تمہاری تعظیم کرتے ہیں" (۱) اسی طرح حضرت ابو طالب کا یہ قول جو انہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ

و آلہ و سلم کا حضرت خدیجہ سے نکاح کرتے ہوئے کہا "حمد ہے اس گھر کے رب کی کہ جس نے ہمیں ابراہیم کے خاندان اور اسماعیل کی ذریت میں سے قرار دیا اور ہمیں اپنے حرم امن کے پاس ٹھہرایا۔ ہمیں لوگوں پر حاکم قرار دیا اور جس شہر میں ہم رہ رہے ہیں اسے ہمارے لئے مبارک قرار دیا"۔ (۲)

چونکہ قریش کا تعلق اسماعیل کی نسل سے تھا اور وہ دین حنیفیت کا احترام کرتے تھے نیز چونکہ مکہ جنگ جو اور غارت گر عربوں کے لئے بھی ایسا حرم امن تھا کہ جو کوئی بھی وہاں پناہ لے لیتا امان میں ہوتا اگر کسی مقتول کا کوئی ولی اپنے بیٹے یا باپ کے قاتل کو بھی وہاں پا لیتا تو بھی اس سے انتقام نہ لے سکتا تھا پس کعبہ کا احترام ان کے نزدیک اس حد تک تھا تو سرداران مکہ بہت زیادہ محترم سمجھے جاتے تھے اور دوسروں سے ممتاز تھے جبکہ خانہ خدا کا احترام مستزاد تھا کہ جس کی طرف ہر سمت سے عرب آتے تھے۔

۱۔ ابن اسحاق اور سہیلی کی طرف رجوع کریں اور اسی پر ابن سلام نے طبقات الشعراء ص ۱۰۶ میں یقین کرتے ہوئے ان شخصیات سے نقل کیا ہے: عمر، عباس، ابن مسعود، مسروق، عکرمۃ، سعید بن جبیر، مجاہد، عطاء، شعبی، مقاتل عبیداللہ بن عمر و ابومیسرۃ، زید بن مسلم، عبداللہ بن شفیق، زہری، القاسم، ابن ابی بردۃ، مکحول، عثمان، سدی، حسن، قتادۃ وغیرہ۔ البدایہ و النہایہ ج۱ ص ۱۵۹ پر بھی اس کا ذکر ہے البتہ وہاں علی اور ابن عباس کے ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے تاہم ہماری نظر میں یہ دونوں قرآن کی مخالفت نہیں کر سکتے بلکہ خود صاحب البدایہ و النہایہ نے ان دونوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ذبیح اسماعیل تھے۔

۲۔ کہا جاتا ہے کہ زوجہ اسماعیل جرہمی تھی یہ لوگ دراصل یمنی قحطانی تھے عدنانی نہیں تھے۔

قریش جب یہ دیکھتے تھے کہ ان کی بزرگی، منزلت اور سروری بلکہ ان کی معیشت تک بھی کعبہ سے خوب وابستہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خانہ خدا کی ہتک حرمت ان کی مصلحت میں نہیں ہے کیونکہ یہ امر خانہ خدا کے تقدس میں کمی کا باعث ہوتا اور اس کی رکھوالی کی حیثیت میں کمی آتی اور یوں وہ اپنی عزیز ترین اور قیمتی ترین چیز سے محروم ہو جاتے اسی وجہ سے انہوں نے "مطیبین" کا معاہدہ کیا اور اس کے بعد وہ معاہدہ ہوا کہ جسے "حلف الفضول" کہتے ہیں یہ وہ معاہدہ ہے کہ جس میں حقوق مظلومین کی ادائیگی کے بارے میں تصریح کی گئی ہے اگرچہ وہ قریش سے ہوں یا کسی اور قبیلے سے نیز اس میں مالی مدد کا بھی تذکرہ ہوا ہے اس بارے میں ہم انشاء اللہ تعالیٰ بعد میں گفتگو کریں گے۔

میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں

اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ جب عبدالمطلب کو چاہ زمزم کھودتے وقت اپنے بارے میں قریش کی دشمنیوں اور سختیوں کا سامنا ہوا تو انہوں نے نذر کی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوئے تو ایک کو راہ خدا میں قربان کر دیں گے۔ جب ان کی دعا قبول ہوگئی اور ان کے دس بیٹے ہوگئے تو انہوں نے ان بیٹوں کو بلایا تاکہ اللہ کے حضور جو نذر انہوں نے کی تھی وہ پوری ہوسکے ان کے بیٹوں نے بھی ان کی بات مان لی اس کے لئے قرعہ ڈالا گیا ابن ہشام کے بقول قرعہ حضرت عبداللہ کے نام نکلا جو ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے البتہ صحیح یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی اولاد کے لحاظ سے سب سے چھوٹے تھے کیونکہ حمزہ اور عباس ان سے بھی چھوٹے تھے اسی طرح ہمیں اس بارے میں بھی شک ہے کہ یہ قرعہ "ہبل" کے نزدیک نکالا گیا اور اس پر عمل درآمد "اساف" اور "نائلہ" کے پاس ہوا کیونکہ عبدالمطلب دین حنیف پر تھے وہ بتوں کا احترام نہیں کرتے تھے اس پر ہم بعد ازاں بات کریں گے۔

عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو ذبح کرنے کا ارادہ کر لیا بیٹے نے بھی باپ کی اطاعت کی لیکن لوگوں نے انھیں اس کام سے روک دیا آخرکار ان کے اور دس اونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا گیا (جو ایک انسان کا خون بہا تھا) تاہم نام عبداللہ کا نکل آیا پھر انھوں نے اونٹوں کی تعداد میں اضافہ کیا قرعہ پھر بھی عبداللہ کے نام نکلتا رہا یہاں تک کہ تعداد ۱۰۰ (سو) ہوئی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔ اسی وجہ سے رسول اکرمؐ نے فرمایا: "انا ابن ذبیحین" یعنی میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں (اسماعیل اور عبد اللہ کا بیٹا ہوں)۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ کی مراد ہابیل اور عبداللہ ہیں کیونکہ بعض روایات کے رو سے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی اسحاق تھے نہ کہ اسماعیل (۱) لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ:

اولاً: سب مانتے ہیں کہ حضرت محمدؐ ہابیل کی اولاد میں سے نہیں ہیں مگر یہ کہ کہا جائے کہ چچا باپ کی طرح ہوتا ہے اور یہ بات ناقابل قبول ہے کیونکہ پہلی بات یہ کہ پہلا ذبیح باپ دوسرے ذبیح باپ عبداللہ کی طرح ہونا چاہیے کیونکہ دونوں کا ایک ہی کلام میں ذکر ہوا ہے اور یہ معقول بات نہیں کہ ایک سے مراد حقیقی باپ ہو اور دوسرے سے مراد مجازی باپ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس چچا کو باپ جیسا کہا جا سکتا ہے اسے عرفاً نزدیک کا چچا ہونا چاہئے نہ کہ جو دسیوں پشتوں میں ہو۔

ثانیاً: ذبیح سے مراد اسحاق نہیں ہیں اس کی دو دلیلیں ہیں:

الف: سورہ صافات میں پہلے واقعہ ذبح کا ذکر ہے اور اس کے بعد حضرت اسحاق کی بشارت کا تذکرہ ہے: "و بشرناہ باسحاق نبیاً من الصالحین". (۲) یعنی اور ہم نے ابراہیم کو صالحین میں سے ایک نبی اسحاق کی بشارت دی ہے۔

۱۔ تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۳۹ اور ۲۴۰

۲۔ سورہ صافات، آیت ۱۱۲

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اسحاق واقعہ قربانی کے بعد پیدا ہوئے اور آیت میں بشارت سے بشارت ولادت ہی مراد ہے اس کے لئے یہ آیت قرینہ ہے: "و بشرناها باسحاق و من وراء اسحاق یعقوب". یعنی اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی۔

یہ استدلال حضرت صادقؑ اور محمد بن کعب قرظی سے منقول ہے (۱) اسی طرح حضرت ابراہیم کی زبانی بھی جس ترتیب کا ذکر ہے اس میں پہلے اسماعیل کا نام آیا ہے اور پھر اسحاق کا، یہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے: "الحمد لله الذی وهب لی علی الکبر اسماعیل و اسحاق". یعنی حمد ہے اس اللہ کی کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کئے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم نے ان دو کا چھ مرتبہ باہم ذکر کیا ہے اور ہمیشہ اسماعیل کا نام اسحاق سے پہلے لیا ہے۔

ب: ان دلائل سے قطع نظر بھی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو ایک بیٹے کی بشارت دے کہ جو آئندہ خود بھی نبی ہوگا، شادی کرے گا اور صاحب فرزند ہوگا پھر اس کی قربانی کا بھی حکم دے۔ یہ بات تو غیر معقول دکھائی دیتی ہے۔ بلاشبہ اس صورت میں قربانی کا حکم حقیقی نہ ہوگا بلکہ صرف رسمی اور ظاہری ہوگا۔ اس سے قربانی کی قدر و قیمت ختم ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان فرمودات پر غور کریں: "و بشرناه باسحاق نبیا". یعنی اور ہم نے اسے اسحاق نبی کی بشارت دی۔

نیز فرمایا: "و امراته قائمة فضحکت، فبشرناها باسحاق و من وراء اسحاق یعقوب". (۲) یعنی اور ان کی بیوی وہاں کھڑی تھی وہ ہنس پڑی، پس ہم نے اسے اسحاق اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔

۱۔ المیزان ج ۱۷ ص ۱۵۵ نیز البدایہ و النہایہ ج ۱ ص ۱۶۱ و ۱۵۹

۲۔ سورہ ہود، آیت ۷۱

اس کے بعد جس سوال کے جواب کی جستجو کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ نئی بات کہاں سے آئی کہ ذبیح اسحاق ہیں؟ اس کا جواب بقول ابن کثیر یہ ہے کہ انھوں نے اسے کعب بن احبار سے حاصل کیا یا اہل کتاب کے صحیفوں سے، واللہ اعلم۔ اس بارے میں کسی معصومؑ سے کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے کہ جسے قبول کرتے ہوئے ہم ظاہر کتاب کو ترک کرنے پر مجبور ہوں۔ (۱) پس یہودیوں کی کوشش تھی کہ اس عقیدے کو مسلمانوں میں رائج کریں اور بزعم خود اس فضیلت کو اپنے جد کی طرف نسبت دیں البتہ انھوں نے یہ بات فراموش کر دی کہ خود "تورات" میں اس بارے میں تضاد موجود ہے مثلاً ایک جگہ پر ہے:

"اپنے اکلوتے بیٹے اسحاق کہ جس سے محبت کرتے ہو کو ساتھ لے لو اور "موریا" کی سرزمین پر چلے جاؤ وہاں اسے پہاڑی پر چڑھاؤ ..."۔ (۲)

اس مقام پر اکلوتا بیٹا کے الفاظ آئے ہیں یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اسحاق ابراہیم کے بڑے بیٹے تھے لیکن تورات خود اپنی تکذیب کرتی ہے اور صراحت سے کہتی ہے کہ اسحاق اکلوتے بیٹے نہ تھے بلکہ جب وہ پیدا ہوئے تو اسماعیل چودہ سال کے تھے۔ (۳)

ابن کثیر کہتے ہیں کہ قوموں کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف نہیں ہے کہ اسماعیلؑ ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے۔ (۴)

۱۔ البدایہ و النہایہ ج ۱ ص ۱۵۹ اور ۱۶۱

۲۔ سفر التکوین، الاصحاح ۲۲، الفقرۃ ۲۳-۱

۳۔ سفر تکوین اصحاح ۱۶ فقرۃ ۱۵، ۱۶ یہاں پر صراحت ہے موجود ہے کہ اسماعیل کی ولادت کے وقت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی سال کی تھی جبکہ اصحاح ۱۷ اور ۱۸ میں تصریح کی گئی ہے کہ ولادت اسماعیل کے وقت ان کے باپ کی عمر ننانوے یا سو سال تھی۔ البدایہ و النہایہ ج ۱ ص ۱۵۳ کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ البدایہ و النہایہ ج ۱ ص ۱۵۷

چند قابل غور نکات

۱۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابراہیم کے ہاں بڑھاپے میں اسماعیل پیدا ہوئے قرآن نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے فطری سی بات ہے کہ انہیں اس بیٹے سے زیادہ محبت ہوگی نیز ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت اسماعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا جب وہ زندگی کے نہایت خوبصورت ایام میں تھے۔ یہ وہ عمر تھی جس میں والدین کی ان سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔ محبت، جذبات میں ڈھلی ہوتی ہے اور مہربانی میں محبت کا امتزاج ہوتا ہے۔

بیٹا بھی ایسا جو کمال انسانی کے اعتبار سے بلند ترین درجات پر تھا عقل و درایت اور کردار و استقامت اور دیگر انسانی فضائل و کمالات میں ممتاز تھا۔

اللہ نے باپ کو ایسے فرزند کی قربانی اور وہ بھی اپنے ہاتھوں پیش کرنے کا حکم دیا۔ ان حالات میں تو ایسے بیٹے کی جدائی ہی انتہائی کٹھن ہوتی ہے چہ جائیکہ یہ جدائی خود باپ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہو۔

ابراہیمؑ نے لبیک کہا اور انہوں نے حکم الٰہی پر سبب پوچھے اور اظہار ناپسندیدگی و تحیر کئے بغیر عمل کیا کیونکہ انہیں اپنے پروردگار کے حسن انتخاب پر اطمینان تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا حکم ان کی بہتری کے لئے ہے۔

آپ نے حکم الٰہی پر عمل کیا لیکن تیزی کے ساتھ نہیں تاکہ اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھیں اور اس اضطراب سے بچیں کہ جو سستی و ضعف کا باعث بنتا ہے۔ انہوں نے بیٹے کو حکم خدا سے آگاہ کیا اور ان سے پوچھا کہ اس بارے میں ان کی حتمی رائے کیا ہے۔ یہ امر اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں اپنے بیٹے کے حسن انتخاب پر اعتماد تھا نیز ان کے رشد عقلی اور اصابت رائے کا احترام رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ انہیں ایسا بچہ نہیں سمجھتے کہ جو کوئی ذمہ داری نہ نبھا سکے۔ حضرت اسماعیلؑ کی توجہ اس امر کی طرف تھی کہ ان کا بذات خود فیصلہ کرتے ہوئے یہ کہا: "یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللہ

من الصابرین"۔ (ابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے بجا لائیں، مجھے آپ انشاء اللہ صابرین میں سے پائیں گے)۔ طبیعی طور پر ان کے والد کے رنج و غم میں اضافے کا باعث ہوگا۔ (۱)

اسماعیل کے لئے ان کے والد نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اجر طاعت پائیں اور حضور حق میں تسلیم ہونے کا لطف اٹھائیں۔ اس لئے یہ بات پہلے ان سے ذکر کی۔ انہوں نے بھی امر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تاہم یہ تسلیم ان کے پیش نظر شجاعت و بہادری کی علامت نہ تھی بلکہ ارادہ الٰہی کے سامنے خشوع کی علامت تھی اور ان کا صبر استمداد الٰہی تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی حالت کو "فلما اسلما" سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ دونوں اللہ تعالیٰ کے حضور تسلیم ہوگئے اور انہوں نے شہوات و خواہشات کے سامنے سر نہیں جھکایا اور نہ وہ مادی و دنیاوی قیود میں گرفتار ہوگئے (۲) لہذا ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام ان افراد میں سے ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ ہر اس چیز سے محبوب تر ہے کہ جس کا اس آیت قرآنی میں صراحت سے ذکر ہے:

"قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا، و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا، احب الیکم من اللہ و رسولہ، و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ، و اللہ لایھدی القوم الفاسقین.

(سورہ توبہ / ۲۴)

۱۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ جب باپ نے یہ دیکھا کہ اس کا بیٹا اس قدر عظیم ہے پھر اس کی قربانی کا فیصلہ اور بھی سخت تر تھا جبھی تو اس کا اجر بھی بہت زیادہ تھا۔ (مترجم)

۲۔ فی ظلال القرآن نامی کتاب میں بھی ہمارے معروضات میں سے کچھ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

یعنی کہہ دیجئے اگر تمہیں تمہارے آباء، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے قبیلے والے اور وہ مال کہ جو تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت کہ جس میں گھاٹا پڑ جانے سے ڈرتے رہتے ہو اور وہ گھر کہ جنہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہو تمہارے نزدیک اللہ، اس کے رسول اور راہ خدا میں جہاد سے محبوب تر ہیں تو پھر منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنے امر کو ظاہر کرے اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

۲۔ واضح ہے کہ اللہ تعالٰی کا اصلی مقصد یہ نہ تھا کہ حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کیا جائے اور ان کا خون بہایا جائے اس لئے کہ خود اللہ تعالٰی حضرت ابراہیمؑ سے فرماتے ہیں "قد صدقت الرؤیا" (تو نے اپنے خواب کو جامہ عمل پہنایا) بلکہ حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے بیٹے کی آزمائش و امتحان مراد تھا۔ لہذا فرماتا ہے: "ان ھذا لھو البلاء المبین"۔ تحقیق یہ کام صرف واضح امتحان ہے۔

اس امتحان کا راز یہ تھا کہ اسماعیلؑ کا تزکیہ نفس کیا جاتا اور انہیں فریضہ نبوتؑ اور رہبری امت کا بوجھ اٹھانے کے قابل بنایا جاتا۔ ابراہیمؑ کے لئے بھی یہ بیشتر تزکیہ و تصفیہ کے لئے امتحان کا ذریعہ تھا۔ بعید نہیں کہ وہ امتحان ان چند باتوں سے عبارت ہو کہ جن کے اتمام پر اللہ تعالٰی نے انہیں انسانوں کی امامت عطا فرمائی:

"و اذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن، قال انی جاعلک للناس اماماً قال و من ذریتی؟ قال لاینال عھدی الظالمین"۔ (سورہ بقرہ / ۱۲۴)

یعنی جب ابراہیمؑ کا اس کے پروردگار نے چند باتوں کے ذریعے امتحان لیا اور انہوں نے اسے پورا کر دیا تو اللہ نے کہا میں تجھے انسانوں کے لئے امام قرار دیتا ہوں وہ کہنے لگے اور میری ذریت میں سے؟ اللہ نے کہا میرا یہ عہد ظالمین کو نہیں ملے گا۔ ذبح کا واقعہ ہی "البلاء المبین" (واضح آزمائش) تھا جیسا کہ آیت نے وضاحت کی ہے۔

جب میں (مصنف) یہ مطالب لکھ چکا تو دیکھا کہ علامہ طباطبائیؒ مرحوم نے بھی ایسے ہی بعض مطالب ذکر کئے ہیں۔ وہ "... من ذریتی" کے ذیل میں استدلال کرتے ہیں کہ یہ

بات اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک اولاد نہ ہو کیونکہ انہیں علم نہیں کہ آئندہ وہ صاحب اولاد ہوں گے یا نہیں۔ ملائکہ کی بشارت سے پہلے ابراہیمؑ ایسی بات ہرگز نہیں کر سکتے تھے جو وہ جانتے نہ ہوں اگر یہ بات ولادت اسماعیلؑ سے قبل ہوتی تو ضروری تھا کہ یوں کہا جاتا:

"و من ذریتی ان رزقتنی ذریة". (1) اور میری ذریت سے اگر تو مجھے ذریت عطا کرے۔

علاوہ ازیں اس امتحان کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ امتحان راہ حق میں قربانی پیش کرنے کے لئے ایک عظیم نمونہ ہو یہ قربانی فقط اعلان اور زبانی نعرے تک نہیں ہونی چاہیے۔ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ ہر مومن اور مومنہ کے لئے اسوہ اور نمونہ بن سکتے ہیں۔

ان دونوں شخصیتوں کے فضائل کو عالم امکان سے نکال کر وجود کے مرحلے میں لے آنا اور ظاہر کرنا دوسروں کے لئے بھی باعث ترغیب ہے کہ ان کے مخفی اور درونی فضائل بھی ظاہر ہوں اور میدان عمل میں آنے کے لئے باعث تحریک ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کام خود انسانوں کی اندرونی خصوصیات و فضائل کے ظہور میں آنے کے لئے ایک موثر جذباتی تحریک کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ وہ ایک زندہ حقیقت کا روپ دھار لیں اور انسانی زندگی میں ہمہ گیر تغیر و تحول پیدا کرنے کے لئے راہنمائی کریں۔

ان باتوں کے علاوہ بعض برادران نے یہ احتمال دیا ہے کہ بعید نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جس معاشرے میں رہتے تھے وہ مادیت میں غرق تھا لہذا اللہ تعالی نے ارادہ کیا کہ انہیں فقط وعظ و نصیحت نہ کی جائے بلکہ عملی نمونہ پیش کر کے راہ حیات کو تبدیل کرنے کی دعوت دی جائے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص اس واقعہ پر غور کر کے بہت سے ایسے مطالب اخذ کرے جو ہم نے بیان نہیں کیے یا جن کی طرف ہم نے اشارہ نہیں کیا۔ توفیق و ہدایت اللہ کی طرف سے ہے۔

1۔ المیزان ج۱ ص ۲٦٧ و ۲٦٨

۳۔ مناسب ہے کہ ہم یہاں پر اشارہ کریں کہ "انا ابن الذبیحین" کہہ کر یقیناً رسول اللہ اظہار افتخار کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ شاید وہ یہ بیان کرنا چاہتے تھے کہ لوگ ان دو عظیم واقعات سے فائدہ حاصل کریں اور یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ آپؐ ان واقعات سے بیگانہ نہیں ہیں۔ جب وہ دونوں تقرب کے اس زینے تک اور حق و تسلیم کی راہ پر چلتے ہوئے فنا کی اس منزل تک آ پہنچے ہیں تو آپ سے بھی اس کے علاوہ کسی اور طرز عمل کی توقع نہیں کرنی چاہئے جو اس سے مختلف ہوتا یا اس سے کم تر۔ بعض لوگوں کا یہ خیال خام ہے کہ رسول اکرمؐ نے یہ بات اظہار افتخار کے لئے کہی ہے جیسے کوئی مقابلہ جیت کر میدان میں کھڑا ہو جائے اور فخر کرنے لگے کیونکہ بات اصول اور عقائد سے متعلق ہے اور مصالح ذاتی کا یہاں پر کوئی دخل نہیں۔

۴۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ حضرت عبدالمطلب کی نذر جائز نہ تھی کیونکہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص دوسرے کے وجود پر اس حد تک تصرف کرے نیز کیا ممکن ہے کہ ایسی نذر کو پورا کرنا واجب سمجھا جائے کہ جس میں عبداللہ بن عبدالمطلب جیسے نفس محترمہ کو ذبح کرنا پڑتا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالمطلب کا ایمان بتدریج منزل کمال کی جانب بڑھتا گیا۔ پہلے مرحلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دو بتوں کے نام پر اپنے بیٹوں کے نام "عبد مناف" اور "عبد العزیٰ" رکھتے ہیں لیکن بعد ازاں اللہ پر تسلیم و ایمان کے اس درجہ پر پہنچتے ہیں کہ مورخین کے بقول ہاتھیوں کے لشکر والا "ابرھہ" ان کے ایمان سے مرعوب ہو جاتا ہے ان کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ چور کا ہاتھ کاٹتے تھے، برہنہ ہو کر طواف کرنے سے روکتے تھے، ایفاء نذر کرتے تھے، معاد اور قیامت پر ایمان رکھتے تھے، زنا، شراب اور محارم سے نکاح کو حرام جانتے تھے۔ اپنی اولاد کو ظلم و سرکشی سے منع کرتے تھے اور انہیں برے کام ترک کر کے پسندیدہ اخلاق اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ بتوں کی پوجا انہوں نے چھوڑ دی تھی اور مستجاب الدعوۃ (ایسی شخصیت جس کی دعا

قبول ہوتی ہو) ہو گئے تھے۔ (۱)

عبدالمطلب کا ایمان انکے پوتے حضرت محمدؐ کی ولادت کے بعد حد اعلیٰ کو پہنچ گیا تھا کیونکہ انہوں نے بہت سی علامات نبوت اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور آنحضرتؐ کی نبوت کی کرامات و دلائل کے آپ خود شاہد تھے لہذا کوئی مانع نہیں کہ پہلے انکا اعتقاد ہو کہ ایک شخص کو اس طرح کی نذر کا حق پہنچتا ہے۔ (۲) عرف عام کے نزدیک بھی یہ کام ناپسندیدہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ثابت نہیں کہ گزشتہ شریعتوں میں ایسا کرنا ممنوع تھا مثلاً زوجہ عمران نے نذر کی کہ انکے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ اسے خدا کے گھر کی خدمت کیلئے وقف کریگی نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو ذبح کریں۔

بداء شیعہ نقطہ نظر سے

مذکورہ مسئلہ کے نتیجے میں ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے اور وہ ہے بداء کا مسئلہ جو شیعوں اور دوسروں کے درمیان باعث اختلاف رہا ہے۔ اس سلسلے میں چونکہ شیعوں پر بہت زیادہ تہمتیں لگائی گئی ہیں اس لئے ہم اس کی کچھ وضاحت کرتے ہیں۔

سیدنا مولانا آیت اللہ المجد سید عبد الحسین شرف الدین مرحوم کہتے ہیں:

"بداء کے مسئلے پر شیعوں کے نظریئے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات انسان کی روزی، عمر، بیماری، صحت و سلامتی، سعادت، شقاوت، رنج و مصائب، ایمان و کفر میں کمی بیشی کر دیتا ہے جیساکہ اس کے اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے:

"یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب". (سورہ رعد / ۳۹) یعنی اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے۔

۱۔ سیرت حلبیة ج ۱ ص ۴۳ اور مسالک الحنفا ص ۴۱ بحوالہ الملل و النحل شہرستانی

۲۔ یہ جواب عظیم محقق سید مہدی روحانی (ایدہ اللہ تعالیٰ) نے دیا ہے۔

یہ عمر ابن خطاب، ابی وائل اور قتادہ کا عقیدہ ہے۔ جناب جابر نے بھی یہی عقیدہ رسولؐ اللہ سے نقل کیا ہے۔ بہت سے بزرگان اللہ کے حضور تضرع و زاری کیا کرتے اور دعا کرتے تھے کہ اللہ انہیں سعادت مندوں میں سے قرار دے نہ کہ اشقیا میں سے۔ یہ مسئلہ ہمارے آئمہؑ سے منقول دعاؤں میں حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے اور بہت سی روایات میں آیا ہے کہ صحیح صدقہ اور والدین سے نیکی اور بھلائی شقاوت کو سعادت میں بدل دیتے ہیں اور عمر میں اضافے کا باعث بنتے ہیں"۔ (۱)

جی ہاں یہی وہ بداء ہے کہ شیعہ اپنے آئمہؑ کی پیروی میں جس کے معتقد ہیں البتہ ایسی نئی رائے کا ظاہر ہونا کہ جو پہلے مجہول ہو یا خلاف مصلحت ہونے کے باعث گزشتہ عمل پر پشیمانی، اس معنی میں بداء اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے اور شیعہ اس کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ علیؑ امیرالمومنین کے پیروکاروں کے لئے ایسا عقیدہ کیونکر ممکن ہے جبکہ وہ نہج البلاغہ میں ایسے ظریف اور باریک معانی بیان کرتے ہیں کہ جن کی گہرائی کے ادراک سے عقل انسان عاجز ہے۔ علیؑ وہی ہیں کہ جن سے اور جن کے معصوم فرزندوں سے لوگ اللہ تعالیٰ کے ہر نقص سے منزہ ہونے کا درس حاصل کرتے ہیں اور اللہ اور اس کی صفات کے بارے میں جن سے دقیق ترین معارف حاصل کرتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "میں اس شخص سے بیزار ہوں کہ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ کو ایسے امر میں بداء حاصل ہوتی ہے کہ جسے وہ کل نہیں جانتا تھا"۔

آپؑ نے یہ بھی فرمایا: "جس شخص کا یہ خیال ہو کہ کسی شئے میں بداء اللہ کی پشیمانی کے باعث ظہور پذیر ہوتی ہے وہ ہمارے نزدیک خدائے عظیم کا منکر ہے"۔

۱۔ کتاب اجوبۃ موسی جار اللہ ص ۸۶ اور ۸۷۔ اس نے وہاں بعض امور کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے مآخذ بھی ذکر کئے ہیں۔

توضیح اور تمثیل

فرض کریں اللہ "زید" کی روزی یا عمر، اس کی طبیعت، عادت اور ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر مقدر فرماتا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ زید صدقہ دے گا کہ جس سے اس کے پہلے سے مقرر شدہ رزق میں اضافہ ہو جائے گا یا جانتا ہے کہ وہ والدین سے حسن سلوک کرے گا اور اس کے سبب اس کی عمر بڑھ جائے گی اللہ تعالیٰ ان تمام امور کو ابتداء ہی سے جانتا ہے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے نبی کو کسی چیز کے ہونے کی خبر دیئے بغیر اسے اس کے موانع سے آگاہ کرے یا یہ جانے کہ آئندہ حالات بدل جائیں گے۔

نبی بھی یہ بات دوسروں کو بتا دیتا ہے لیکن بعد ازاں اس کے موانع سے آگاہ ہوتا ہے یا یہ کہ اس امر کے وجود میں آنے کے لئے ایسی شرائط کی ضرورت ہے کہ جو اب موجود نہیں ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ ابتداء تا انتہا ان تمام امور سے آگاہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا علم ذاتی ہے اور وہ اپنے علم سے اپنے رسول کو آگاہ کرتا ہے یا اسے لوح محو و اثبات میں ثبت کرتا ہے جیساکہ ان دو علموں کے بارے میں اشارہ فرماتا ہے: "یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب"۔ (سورہ رعد / ۳۹) یعنی اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے۔

ایک اور مثال عرض کرتے ہیں اگر ہم کوئی ایسا گھر بنائیں کہ عام حالات میں جس کی عمر سو سال ہونی چاہیے لیکن کوئی طوفان، زلزلہ، سیلاب یا کوئی دوسری آفت اس کے قائم رہنے میں مانع ہو جائے اور وہ دس برس میں ہی تباہ ہو جائے۔

جبکہ ہم نے لوگوں سے کہا ہو کہ یہ گھر سو سال تک باقی رہے گا اگرچہ ہم جانتے ہوں کہ یہ کسی سیلاب کی وجہ سے تباہ ہو جائے گا۔ اگر دوسرے مرحلے میں ہم پھر یہ کہیں کہ یہ گھر دس سال میں منہدم ہو جائے گا تو یہ دونوں باتیں صحیح ہوں گی۔ بعض اوقات کسی ناگزیر اور اہم مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ہم پہلی خبر دیں۔

امام زمانؑ کے ظہور کی بعض علامتیں بھی اسی طرح کی ہیں کیونکہ ان میں سے بعض حتمی علامتوں کی حیثیت سے بیان ہوئی ہیں اور بعض کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے لہذا ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ظاہر ہو اور وجود میں آئیں اور بعض کچھ موانع پیدا ہونے کی وجہ سے ظہور میں نہ آئیں جن کی مخبر نے طبیعی حالات کی روشنی میں موانع و عوارض سے قطع نظر خبر دے دی ہو۔

لہذا ممکن ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا واقعہ اسی قسم کا ہو یعنی اللہ تعالٰی نے کسی امتحان وغیرہ جیسی مصلحت کی بنیاد پر حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا ہو پھر اسے ایک ذبح عظیم کے بدلے بچا لیا اور ابراہیمؑ کو خبر دی کہ انہوں نے یقیناً اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔

امام جعفر صادقؑ کے بیٹے اسماعیل کا واقعہ بھی شاید اسی نوعیت کا ہے وہ یوں کہ مصلحت کا تقاضا ہو کہ لوگوں کی توجہ اسماعیل کی طرف ہے اورامام حق خطرات سے محفوظ رہیں جب اسماعیل وفات پاگئے تو واضح ہوگیا کہ حقیقی امام ان کے بھائی موسیٰ کاظم علیہ السلام ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بداء کا لفظی معنی ہے "ظاہر ہوا" نہ کہ "اظہار کیا" لہذا اللہ کے لئے بداء ہونے کا یہ معنی ہونا چاہیے کہ خدا عالم ہوا اور اس کے لئے وہ کچھ ظاہر ہوا جس سے وہ جاہل تھا حالانکہ آپ کے قول کے مطابق یہ اللہ کے لئے محال ہے۔ لہذا امام علیہ السلام کے اس قول کی کیا توجیہہ ہوگی: "ما بداء للّٰہ فی شیئی کما بداء لہ فی اسماعیل". یعنی اسماعیل کے مسئلے میں جو بداء اللہ کو ہوئی کسی اور میں نہیں ہوا۔ اسی طرح سے یہ الفاظ بھی روایات میں ہیں "بداء لہ" یا "بداء للّٰہ"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "و نادیناہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا". (سورہ صافات / ۱۰۴) یعنی ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم تحقیق تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ نیز یہ بھی فرمایا: "و بداہ لھم سیئات ما کسبوا". (سورہ زمر / ۴۸) یعنی جو برائیاں انھوں نے کمائی تھیں ان پر محقق ہو گئیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ بداء اظہار یا ظہور کے معنی میں نہیں بلکہ عالم کون و وجود میں معلوم چیز کے تحقق کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں "علم" کا لفظ استعمال ہوا ہے: "ثم بعثناھم لنعلم ای الحزبین احصی لما لبثوا امدا". (سورہ کہف / ۱۲) یعنی پھر ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ ہم جان لیں کہ ان میں کونسا گروہ ان کی مدت قیام کا شمار کر سکتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا: "و لنبلونکم حتی نعلم المجاھدین منکم و الصابرین' و نبلوا اخبارکم". (سورہ محمد / ۳۱) یعنی اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے تاکہ جان لیں کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور کون صابر ہے اور اس لئے کہ تمہاری خبروں کی جانچ کر لیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا: "و ما جعلنا القبلة التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ". (سورہ بقرہ / ۱۴۳) یعنی ہم نے اس قبلہ کو جس پر تو تھا صرف اس لئے قبلہ قرار دیا تھا کہ ہم ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں الٹے پاؤں پلٹ جانے والوں سے پرکھ لیں۔

مراد یہ ہے تاکہ ہمارا معلوم متحقق ہو جائے اور عالم وجود کا روپ دھار لے۔ بداء بھی یہی کچھ ہے لہذا "بداء لہ" کا معنی اس کے علم کا خارج میں وجود پذیر ہو جانا اور صفحہ ہستی پر نمودار ہو جانا ہے۔ (۱)

۱۔ اس مطلب کے لئے ہم نے محقق گرامی سید مہدی روحانی سے استفادہ کیا ہے (اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے)۔

یہود اور بداء

اگر ہم بداء کا یقین نہ رکھیں تو پھر یہودیوں کی طرح ہو جائیں گے جن کے غلط اعتقاد کی خود خدا تعالیٰ خبر دیتا ہے۔ یہودیوں نے اللہ کا انکار کرتے ہوئے کہا: "اللہ نے رزق اور اشیاء کو ازل ہی سے معین کر دیا ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس نے "جف القلم" (۱) کر دیا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یوں مذمت کی ہے: "و قالت الیهود: یدالله مغلولة، غلت ایدیهم، و لعنوا بما قالوا، بل یداه مبسوطتان، ینفق کیف یشاء". (سورہ مائدہ / ۶۴) یعنی یہودیوں نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے ان کے اپنے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کے سبب وہ لعنت کیے گئے ہیں جبکہ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے انفاق کرتا ہے"۔

لہذا بداء اسلامی عقائد کی ایک ضرورت ہے اور یہ اللہ کی تنزیہ و توحید کے لوازم و مقتضیات میں سے ہے۔ بداء کا یہی مفہوم آیات و احادیث کے ساتھ ہماہنگ ہے۔

۱۔ اس کا لفظی معنی ہے "اس نے قلم کو خشک کر دیا ہے" مراد یہ ہے کہ مخلوقات کے تمام امور کو وہ مقدر کر کے فارغ ہو چکا ہے۔ (مترجم)

دوسری فصل

آنحضرتؐ کی ولادت سے بعثت تک

رسول اکرمؐ کا نسب گرامی

آپ ہیں حضرت ابو القاسم محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب (شیبة الحمد) بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانۃ بن خزیمۃ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان ... ۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کا نسب شریف جناب عدنان تک متفق علیہ ہے۔ اس کے بعد بہت اختلاف ہے تاہم اس امر میں کوئی شک نہیں کہ عدنان کا نسب حضرت اسماعیلؑ تک جا پہنچتا ہے۔

منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "اذا بلغ نسبی الی عدنان فامسکوا"۔ (۱) یعنی جب میرا نسب عدنان تک پہنچے تو ٹھہر جاؤ، ہم نے بھی آپ کے امر کی اتباع میں توقف کیا ہے۔

آپؐ کی والدہ آمنہ قبیلہ بنی زہرہ کے سردار وھب بن عبد مناف بن زھرۃ بن کلاب کی بیٹی تھیں۔

۱۔ کشف الغمہ ج ۱ ص ۱۵

نبی کریمؐ کی ولادت

قول مشہور (۱) کی بنا پر آنحضرتؐ مکہ میں اس سال دنیا میں تشریف لائے جسے "عام الفیل" کہتے ہیں اور یہ بعثت سے چالیس سال پہلے کی بات ہے۔

"امامیہ" اور بعض دوسروں کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ آپؐ کا یوم ولادت سترہ ربیع الاول ہے لیکن امامیہ کے علاوہ دوسروں (کلینی نے بھی جن کی تائید کی ہے) کا نظریہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا یوم ولادت ۱۲ ربیع الاول ہے۔ (۲) ان کے علاوہ دیگر اقوال بھی ہیں کہ جن کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

"طبری" اور "کلینی" نے تصریح کی ہے کہ آنحضرتؐ روز جمعہ دنیا میں تشریف لائے جبکہ غیر امامیہ حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ آپؐ پیر کے دن پیدا ہوئے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ کی مادر گرامی "ایام تشریق" یعنی گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحجہ میں حاملہ ہوگئیں۔ (۳)

لیکن اس پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر پیغمبر اکرمؐ اسی سال دنیا میں تشریف لے آئے تھے تو آپؐ کے لئے مدت حمل چار ماہ اور چند روز بنتی ہے اور اگر آپ کی پیدائش بعد کے سال میں ہو تو مدت حمل سولہ ماہ ہوگی۔ جبکہ امامیہ کے نزدیک کم ترین مدت حمل چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مذکورہ قول اس بات پر مبنی ہے کہ عرب جان بوجھ کر حرام مہینوں کو بھلا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مثلاً حرام مہینے چار ماہ بعد شروع ہوں

۱۔ سیرۃ مغلطای ص ۷، تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۱۹۵ وغیرہ، اس قول کو متفق علیہ بھی کہا گیا ہے۔

۲۔ اصول کافی ج ۱ ص ۴۳۹ (مطبوعہ ۱۳۸۸ مکتبۃ الاسلامیۃ طہران)

۳۔ اصول کافی ج ۱ ص ۴۳۹، نیز دیکھئے تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۱۹۶

گے۔ جبکہ ان حرام مہینوں میں کہ جن کی حرمت کو انہوں نے اپنی طرف سے ختم کر دیا تھا جنگ و قتال کو جائز سمجھتے تھے۔

لیکن اگر روایت کی سند صحیح ہو اور ہم اس چیز کے قائل بھی نہ ہوں کہ چار ماہ کا حمل پیامبر اکرمؐ کے لئے مختص ہے تو خود اس جواب پر بھی اشکال وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ روایت کو حرام مہینوں کے بھلانے پر مبنی قرار دینے کے لئے بھی دلیل کی ضرورت ہے کیونکہ آئمہ معصومینؑ کے کلام میں بھی ایسی کوئی تعبیر موجود نہیں۔ اسی طرح محدثین اور مورخین کے کلام میں بھی ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔

ایک اہم یاد دہانی

"اربلی" مرحوم پیغمبر اکرمؐ کی تاریخ ولادت میں اختلاف کی طرف اشارہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "آنحضرتؐ کے روز ولادت میں اختلاف ایک معمولی بات ہے کیونکہ اس زمانے کے عرب آنحضرتؐ اور آپؐ کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ لوگ ان پڑھ تھے یہاں تک کہ اپنی اولاد کے روز ولادت کو بھی لکھنا نہیں جانتے تھے۔ البتہ آپؐ کی وفات کے بارے میں ان کا اختلاف عجیب بات ہے اور اس سے بڑھ کر عجیب و غریب ان کا اذان اور اقامت میں اختلاف ہے بلکہ آنحضرتؐ کی وفات کے بارے میں اختلاف عجیب ترین امر ہے کیونکہ اذان کے متعلق ممکن ہے ہر گروہ اس میں روایت اور سند کا ادعا کرے جبکہ یوم وفات تو معلوم و معین ہونا چاہیے تھا"۔ (۱)

اربلی کی بات واضح ہے وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے روز ولادت میں اختلاف کی توجیہات پیش کرنا ممکن ہے لیکن جو چیز واقعاً حیرت انگیز ہے وہ آنحضرتؐ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ آپؐ ان کے لئے فرشتہ نجات تھے آپ انہیں ظلمت کے اندھیروں سے

۱۔ کشف الغمۃ ج ۱ ص ۱۵

نکال کر نور کی طرف لائے، موت سے نکال کر زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ ان تمام باتوں کو سمجھنے کے باوجود ایسا ہوا جبکہ کوئی اور سیاسی یا مذہبی مقصد جو تاریخ میں ابہام، اجمال یا اس میں خرابی پیدا کرنے کا موجب بنتا، کار فرما نہیں تھا۔ یہی بات باعث تعجب ہے۔

اس سے بڑھ کر حیران کن امر یہ ہے کہ انھوں نے ایسے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا جن پر انھوں نے نبی اکرمؐ کے ساتھ رہ کر کئی سال عمل کیا یہاں تک کہ آپ دیکھتے ہیں کہ نماز اور وضوء کے بارے میں بھی آنحضرتؐ سے متضاد روایات نقل کرتے ہیں جبکہ روزانہ پانچ مرتبہ آپؐ کے ساتھ وہ ان اعمال کو انجام دیتے تھے اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض کہتے ہیں کہ مسلمان آپؐ کی ریش مبارک کی حرکت سے سمجھتے تھے کہ آپؐ نماز ظہر یا عصر کی قرائت میں مشغول ہیں۔ (۱)

ان کا اذان میں اختلاف جسے وہ بچپن سے سنتے آئے تھے نیز روشن ہے جیساکہ اربلی مرحوم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اب اس پس منظر میں ان احکام اور امور میں جن سے انھیں کم واسطہ پڑتا تھا یا ان میں کم مبتلا ہوتے تھے، ان کی معرفت اور آگاہی کا کیا عالم ہوگا؟

ان حالات میں کیا اصحاب کا کردار اور گفتار حتمی سنت اور قابل اطاعت شریعت کے طور پر معتبر ہو سکتی ہے؟ جیساکہ بعض اسلامی فرقے یہ نظریہ رکھتے ہیں بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض افراد ایک صحابی یا قاضی کے قول کی وجہ سے صحیح حدیث کو رد کر دیتے ہیں! اور یہ واقعاً بڑے تعجب کی بات ہے!!

۱۔ صحیح بخاری چھاپ ۱۳۰۹ ہجری ج ۱ ص ۹۰ اور ۹۳، مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۰۹ اور ۱۱۲ اور سنن الکبری للبیہقی ج ۲ ص ۳۷ اور ۵۴ صحیحین سے نقل کرتے ہوئے۔

جب وہ ان جیسے امور اور مسائل میں بھی اختلاف رکھتے ہیں تو کیا ان میں سے بعض کا یہ قول قابل قبول ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ نے امت کو قائد، رہبر، معلم اور مرشد کے بغیر چھوڑ دیا اور امت کی مہار خود امت کی گردن پر ڈال دی، کیا اس لئے کہ امت ہدایت اور رہبریت سے بے نیاز ہے؟ یہ مسئلہ بہت ہی اہم ہے اس پر مفصل بحث و تمحیص کی ضرورت ہے۔

نبی اکرمؐ کی جائے ولادت کا حال

آنحضرتؐ کی ولادت با سعادت شعب ابیطالب میں جس گھر میں ہوئی تھی اسے بعد میں حجاج کے بھائی "محمد بن یوسف" نے حضرت ابو طالب سے خرید لیا پھر ہارون رشید کی ماں "خیزران" نے اسے مسجد میں بدل دیا لوگ وہاں آکر نماز پڑھتے تھے (۱) اور اس کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے اور اسے متبرک سمجھتے تھے یہ ہمارے زمانے تک اپنی اسی حالت پر باقی رہا یہاں تک کہ وہابیوں نے جب مکہ پر قبضہ کیا تو اسے ویران کر دیا اور لوگوں کو زیارت کرنے سے منع کر دیا کیونکہ انبیاء اور صالحین کے آثار کی زیارت اور تعظیم سے روکنا ان کی عادت ہے اور اس گھر کو انھوں نے اصطبل بنا دیا۔ (۲)

رسول اکرمؐ کی رضاعت

کہا جاتا ہے کہ آپؐ کی والدہ ماجدہ نے دو یا تین روز آپؐ کو دودھ پلایا اس کے بعد کچھ دن ابولہب کی کنیز ثویبہ نے دودھ پلایا (۳) پھر جب حلیمہ سعدیہ اپنے ساتھیوں کے

۱۔ اصول کافی ج ۱ ص ۳۶۴

۲۔ اعیان الشیعۃ ج ۲ ص ۷

۳۔ قاموس الرجال ج ۱۰ ص ۳۱۷ ترجمہ ثویبہ البلاذری سے

ہمراہ مکہ آئیں اور وہ کسی بچے کی تلاش میں تھیں تاکہ اسے دودھ پلا کر اپنی روزی کا بندوبست کریں، نبی اکرمؐ کو اس کے حوالے کرنے کی تجویز پیش ہوئی اس نے پہلے تو آپؐ کے یتیم ہونے کی وجہ سے انکار کیا لیکن جب اسے کوئی اور بچہ نہ ملا تو وہ واپس آئی اور آپؐ کو دودھ پلانے کے لئے اٹھا لیا۔ اس نے زندگی میں آپؐ سے بہت خیر و برکت کا مشاہدہ کیا انہوں نے دو سال تک آپؐ کو دودھ پلایا جب آپؐ پانچ سال اور دو دن کے ہوگئے تو وہ آپؐ کو خاندان والوں کے پاس واپس لے آئیں (جیساکہ نقل کیا جاتا ہے) اس کے بعد آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کی زیر کفالت پرورش پانے لگے اور ان کے بعد آپؐ اپنے چچا ابو طالب کی آغوش میں پروان چڑھنے لگے۔

علامہ محقق سید مہدی روحانی کہتے ہیں: "یہ بات کہ پہلے تو حلیمہ سعدیہ نے یتیم ہونے کی بنا پر آپؐ کو لینے سے انکار کر دیا اس یتیم کے بارے میں تو صحیح ہے جس کا کوئی والی وارث نہ ہو اور اس کی کوئی اہمیت نہ ہو لیکن حضرت محمدؐ کے بارے میں درست نہیں ہے جس کے کفیل وادی مکہ کے سردار عبدالمطلب ہوں، جس کی ماں آمنہ بنت وھب اشراف مکہ میں سے ہو۔ اس کے علاوہ بعض افراد یہ بھی کہتے ہیں کہ آپؐ اس وقت یتیم نہیں تھے اور آپؐ کے والد گرامی ولادت کے چند ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ بعض کہتے ہیں اٹھائیس ماہ بعد اور بعض کے نزدیک سات ماہ بعد آپؐ کے والد نے دنیا کو الوداع کیا" (۱)

بہرحال اشراف مکہ کی یہ عادت تھی کہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے صحرائی علاقوں میں بھیجتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح بچوں کی نشو و نما کی لحاظ سے اچھی ہوتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ صفة الصفوة ج ۱ ص ۵۱ اور کشف الغمة ج۱ ص ۱٦

۱۔ جسمانی طور پر صحت مند اور توانا ہونا، کیونکہ وہ کھلی اور صاف فضا میں سانس لیتے ہیں انہیں قدرتی مشکلات اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے اسکے اندر مختلف حالات اور گوناگوں واقعات کا مقابلہ کرنے اور سختیوں کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہوجاتی ہے۔

۲۔ زبان کے لحاظ سے فصیح تر ہونا، کیونکہ دوسرے علاقوں اور قوموں کے افراد سے ان کا میل جول بہت کم ہوتا تھا خصوصاً مکہ کی نسبت جو ان دنوں ایک تجارتی مرکز تھا اور اس کے دوسری قوموں اور علاقوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے اس کے مکین سردیوں اور گرمیوں میں ہمسایہ ممالک کے قریب کے شہروں کا سفر کرتے تھے اس لئے ان کی زبان کا کم وبیش متاثر ہونا بعید نہیں تھا۔

۳۔ جرات مند ہونا، اس دلیل کی بنا پر جس کی طرف پہلی فصل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۴۔ فکر اور ذوق کا خالص ہونا، کیونکہ وہ شہری زندگی کی پریشانیوں، مشکلات اور چکر بازیوں سے دور رہتا ہے وہ صحرا اور بیابان میں ان پیچیدگیوں سے ہٹ کر سادہ اور تنہا زندگی گزارتا ہے وہاں پر زندگی قدرتی اصولوں کے مطابق چلتی ہے اور شہر میں زندگی کی مشکلات کی وجہ سے انسانوں کے افکار منحرف ہو جاتے ہیں جبکہ اس قدرتی ماحول میں انسان کے افکار منحرف نہیں ہوتے اسے فکر اور تدبر کرنے کا موقع ملتا ہے اسے اسرار طبیعت اور ہستی کی شناخت اور معرفت حاصل کرنے کی فرصت ملتی ہے اگرچہ یہ اس کے بچپن کا مختصر سا دور ہوتا ہے اور اس کی معلومات بھی کم ہوتی ہیں۔

اسی لئے وہ خلاق اور بہترین فکر کا حامل ہوتا ہے اور ایک صاف و شفاف اور غنی مزاج اور ذوق کا مالک ہوتا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب وہ تمام زندگی وہاں نہ گزارے کیونکہ بیابان اور صحرا میں زندگی جاری رکھنا انسان کو جمود اور سردمہری سے دوچار کر دیتا ہے اس دوران وہ اپنے لئے مفاہیم اور افکار بناتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لئے حقائق کی صورت اختیار کر لیتے ہیں پھر وہ ان کے خلاف کوئی بات نہیں سنتا اور ان سے

ہٹ کر کسی دوسرے کی رائے کو قبول کرنا اس کے لئے انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر انسان اپنی رائے پر تنقید اور مخالف رائے کو برداشت کرنے کی عادت بنا لے تو وہ فکری استبداد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ وہ اہل دلیل و برہان بن جاتا ہے اور پاکیزہ افکار کا حامل ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کے پاس اگر دلیل نہ ہو تو وہ اپنے غلط افکار سے ان افکار کو اپنا کر جن پر وہ استدلال کر سکتا ہے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہ ایک طبیعی امر ہے جسے انسان مشاہدہ کے ذریعے جان سکتا ہے اور تجربے کے ذریعے اس پر استدلال قائم کر سکتا ہے۔

حدیث شق الصدر

اب جبکہ ہم طائفہ بنی سعدہ میں آنحضرتؐ کے دودھ پلانے کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اس مقام پر اسی مناسبت سے وارد ہونے والی ایک حدیث پر بحث کرنا اور اپنی رائے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ حدیث یہ ہے کہ مسلم بن حجاج، انس بن مالک سے نقل کرتا ہے: "جب رسول اللہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول تھے تو جبرئیلؑ آپؐ کے پاس آئے، آپؐ کو پکڑا اور زمین پر لٹا دیا پھر آپؐ کے سینے کو چاک کیا اس میں سے دل باہر نکالا اور دل سے خون کا ایک لوتھڑا نکالا اور کہا کہ یہ تیرے اندر شیطانی حصہ ہے پھر اسنے آپکے دل کو سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا پھر اسے درست کرنے کے بعد اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ بچے دوڑتے ہوئے آپکی ماں (جو درحقیقت آپکی دایہ تھی) کے پاس آئے اور کہا کہ محمدؐ قتل ہوگئے وہ سب آپکی طرف آئے اور آپؐ کا رنگ اڑا ہوا پایا"۔

انس کہتا ہے کہ میں نے ان ٹانکوں کا نشان آپ کے سینہ مبارک پر دیکھا ہے"۔ (۱)

اور یہی بات آپؐ کی اپنی والدہ کے پاس واپسی کا سبب بنی۔ (۲)

۱۔ صحیح مسلم ج۱ ص ۱۰۱ و ۱۰۲۔ آپکے سینہ پھاڑنے کے متعلق اور بھی روایات وہاں ذکر کی گئی ہیں، خواہشمند افراد وہاں رجوع کرسکتے ہے۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ج۱ ص ۱۶۴ و ۱۶۵ اور تاریخ یعقوبی ج۲ ص ۱۰ وغیرہ۔

امامیہ کے علاوہ حدیث اور سیرت کی اکثر کتب میں یہ روایت موجود ہے۔ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ آپؐ کے سینے کو پانچ مرتبہ چاک کیا گیا، جن میں چار دفعہ ثابت ہے جبکہ پانچویں مرتبہ میں اختلاف ہے جیساکہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلی مرتبہ تین سال کی عمر میں، دوسری مرتبہ دس سال کی عمر میں، تیسری مرتبہ بعثت کے وقت اور چوتھی مرتبہ معراج کی رات چاک کیا گیا۔

روایت کا جائزہ

کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے سینے کو بار بار چاک کرنا آپؐ کی عظمت اور مقام میں اضافے کا باعث ہے۔ بعض شعراء نے روایت کے مضمون کو نظم کی صورت میں بیان کیا ہے۔

ایا طالباً نظم الفرائد فی عقد
مواطن فیہا شق صدر لذی رشد

لقد شق صدر للنبی محمد
مراراً لتشریف، و ذا غایۃ المجد

فاولی لہ التشریف فیہا مؤثل
لتطہیرہ من مضغۃ فی بنی سعد

و ثانیۃ کانت لہ و ہو یافع
و ثالثۃ للمبعث الطیب الند

و رابعۃ عند العروج لربہ
و ذا باتفاق فاستمع یا اخا الرشد

و خامسۃ فیہا خلاف ترکتہا
لفقدان تصحیح لہا عند ذی النقد (۱)

۱۔ رجوع کریں: اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۱۸۶

اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اس روایت کو "ارھاصات" (۱) نبوت میں شمار کرتے ہیں جیساکہ شاعر نے اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے (۲) اور یہ بات خوشگوار حیرت کا موجب ہے۔ جبکہ دوسری طرف غیر مسلم یا تو اس کا تمسخر اور مذاق اڑاتے ہیں یا وہ اپنے بعض باطل عقائد پر اسے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے بعض عقائد کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ جیساکہ بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

ہم تیسرے فریق کو بھی ملاحظہ کرتے ہیں جو اس روایت کو ان افراد کے حوالے سے جعلی قرار دیتا ہے جو اسے آیت مبارکہ "الم نشرح لک صدرک، و وضعنا عنک وزرک" کی لفظی تفسیر قرار دینا چاہتے ہیں۔ (۳)

مجمع البیان کے مصنف نے بھی ظاہر روایت کو درست تسلیم نہیں کیا ہے اور اس کی تاویل کو بھی بعید اور مشکل خیال کیا ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم ہر عیب اور برائی سے پاک اور مطہر تھے لہذا آپ کے اندرونی نظریات اور قلب مبارک کا پانی کے ذریعے پاک ہونا کیسے ممکن ہے؟ (۴)

۱۔ ان واقعات کو کہا جاتا ہے جو آنحضرت (ص) کی ولادت کے ساتھ رونما ہوئے تھے مثلاً ایوان کسری کا ٹوٹ جانا وغیرہ

۲۔ فقہ السیرۃ للبوطی ص ۵۳ اور رجوع کریں سیرۃ المصطفیٰ للحسنی ص ۳۶

۳۔ محمد حسنین ہیکل کی کتاب "حیات محمد" ص ۷۳ اور خطیب کی کتاب "النبی محمد" ص ۱۹۷ کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ المیزان ج ۱۳ ص ۳۳، مجمع البیان سے نقل کرتے ہوئے۔

بعض علماء روایت کی سند پر اعتراض کرتے ہیں (۱) البتہ ان کا اعتراض صرف ابن ہشام کی روایت پر ہوتا ہے جو اس نے بعض اہل علم سے نقل کی ہے۔ حالانکہ ان کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ یہی روایت صحیح مسلم میں چار ذرائع سے نقل ہوئی ہے اور اگر وہ اس سے آگاہ ہوتے تو روایت کے حق میں ان کا موقف اور زیادہ سخت ہوتا کیونکہ اس صورت میں روایت ان کے لئے وحی منزل کا درجہ پا لیتی۔ شیخ محمد عبدہ نے بھی اس حدیث میں شک کا اظہار کیا ہے جیساکہ "ابوریۃ" نے ان سے نقل کیا ہے۔

اور شاید اس حدیث پر سب سے عمدہ، مناسب اور بہترین اعتراض علامہ شیخ محمد ابوریۃ کا ہے جو انھوں نے اپنی گراں بہا کتاب "اضواء علی السنۃ المحمدیۃ" میں بیان کیا ہے۔

اس روایت کے متعلق ہمارا نظریہ

اس کے متعلق چند امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ ابن ہشام اور دوسرے افراد بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کا اپنی والدہ کے پاس لوٹنے کا سبب یہ تھا کہ حبشہ کے چند عیسائیوں نے آپؐ کو اپنی دایہ کے ساتھ دیکھا اور آپؐ سے کچھ سوالات کئے اور آپؐ کا بغور جائزہ لینے کے بعد ان سے کہنے لگے کہ "ہم اس بچے کو پکڑلیں گے اور اسے اپنی سرزمین میں لے جائیں گے"۔ (۲)

اس بنا پر سابقہ روایت جو آنحضرتؐ کی ماں کے پاس واپسی کا سبب آپؐ کا سینہ چاک ہونا بتاتی ہے مشکوک ہو جاتی ہے۔

۱۔ عبد الکریم خطیب کی کتاب "النبی محمد" ص ۱۹۶

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۷ اور تاریخ طبری ج ۱، ص ۵۷۵

۲۔ حضور اکرمؐ کا سینہ چاک ہونا آنحضرتؐ کی والدہ کے پاس واپسی کا سبب کیسے بن سکتا ہے جبکہ وہ خود یہ کہتے ہیں آپؐ کے ساتھ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپؐ کی عمر مبارک تین سال یا دو سال اور چند ماہ تھی حالانکہ آنحضرتؐ پانچ برس پورے کرنے کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کے پاس واپس لوٹے تھے۔

۳۔ کیا یہ درست ہے کہ ایک خون کا لوتھڑا یا غدود قلب کے اندر شرور کا منبع قرار پائے اور اس کی صفائی کے لئے آپریشن کی ضرورت پڑے؟

کیا ان کی مراد یہ ہے کہ اس غدود کو نکالنے کے لئے جس کا بھی آپریشن کیا جائے وہ پرہیزگار، متقی اور نیک انسان بن جائے گا؟

یا ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غدود یا خون کا لوتھڑا بنی آدم میں سے صرف نبی اکرمؐ کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور انہیں ہی اس میں مبتلا کیا ہے؟ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے انسان اس میں مبتلا کیوں نہیں ہوئے؟

۴۔ اس عمل کو مختلف وقتوں کے ساتھ چار یا پانچ مرتبہ کیوں دہرایا گیا؟ یہاں تک کہ بعثت کے چند سال بعد اور معراج کے موقعہ پر ایسا کیوں کیا گیا؟

کیا وہ خونی لوتھڑا یا غدود یا شیطان کا حصہ ایک دفعہ جڑ سے اکھاڑنے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہوگیا تھا؟ کیا وہ کسی ایسے کینسر کی کوئی قسم تھی جو آپریشن سے بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ آپریشن کے بعد پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔

وہ غدود چوتھے یا پانچویں آپریشن کے بعد دوبارہ کیوں پیدا نہیں ہوئی اور اس کے بعد پھر آپریشن کی ضرورت نہ رہی؟

کس دلیل کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اس عذاب میں مبتلا کیا اور کیوں اسے اس مصیبت اور تکلیف سے دوچار کیا جبکہ وہ کسی جرم کے مرتکب بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہیں اس کی سزا دی جاتی۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ابتداء ہی سے ایسی غدود کے بغیر خلق فرماتا؟

۵۔ اگر اللہ تعالی چاہے کہ اس کا بندہ برا نہ ہو تو کیا اس کے لئے اسے لوگوں کے سامنے اس قسم کے آپریشن کی ضرورت ہے؟ اور جبرئیل اور دوسرے فرشتوں نے میڈیکل کا علم کہاں سے سیکھا تھا کہ انھوں نے اس طرح کے نادر آپریشن کرنے کا اعزاز حاصل کیا؟

کیا اس روایت کا یہ مطلب نہیں کہ حضورؐ نیک اعمال انجام دینے پر مجبور تھے اور اعمال خیر کی انجام دہی میں ان کے ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا کیونکہ آپؐ جبری طور پر اور آپریشن (کہ جس کے ٹانکوں کے نشان انس بن مالک نے آپؐ کے سینہ مبارک پر دیکھے تھے) کے ذریعے سے شیطان کی دسترس سے قطعاً دور تھے۔

۶۔ آخر یہ عمل صرف ہمارے پیارے نبیؐ کے ساتھ مخصوص کیوں ہے؟ جبکہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ عمل انجام نہیں دیا گیا؟ کیا یہ بات معقول ہے کیونکہ آپؐ تمام انبیاء سے افضل اور اکمل تھے لہذا آپریشن کرنے کی ضرورت تھی؟ اس صورت میں آنحضرتؐ باقی رسل سے کس طرح افضل اور اکمل قرار پائیں گے؟ یا یوں کہا جائے کہ شیطان کو ان انبیاء علیہم السلام پر ایک قسم کی دسترس حاصل تھی جو آپریشن کے ذریعے سے زائل نہیں ہوئی تھی کیونکہ ملائکہ نے اس وقت تک آپریشن کا طریقہ کار نہیں سیکھا تھا۔

۷۔ ان تمام باتوں کے علاوہ کیا یہ حدیث قرآن کی آیات سے منافی نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا کے مخلص بندوں پر شیطان کو کسی قسم کا تسلط اور دسترس حاصل نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "قال رب بما اغویتنی لازینن لھم فی الارض، و لاغوینھم اجمعین. الا عبادک منھم المخلصین". (سورہ حجر/۳۹-۴۰) یعنی شیطان نے کہا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھے راستہ سے الگ کیا میں بھی ان کے لئے دنیا میں (ساز و سامان کو) عمدہ کر دکھاؤں گا اور سب کو ضرور بہکاؤں گا مگر ان میں سے تیرے خاص بندے کہ وہ میرے بہکانے میں نہ آئیں گے۔

و نیز قرآن میں فرماتا ہے: "ان عبادی لیس لک علیھم سلطان". (سورہ اسراء/۶۵) یعنی میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: "انہ لیس لہ سلطان علی الذین آمنوا و علی ربہم یتوکلون". (سورہ نحل/۹۹) یعنی اور شیطان کو مومنین اور اپنے پروردگار پر توکل کرنے والوں پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ کے خالص اور بہترین بندے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کس طرح ممکن ہے کہ رسول اعظمؐ پر معراج کی رات تک شیطان کو قدرت اور دسترس حاصل رہی ہو؟

یہ اس روایت کے بارے میں تمام مطالب تھے البتہ یہ سب کچھ اس شدید تضاد کے علاوہ ہے جو ان روایات میں پایا جاتا ہے جن کی طرف سیرت المصطفیٰ کے مصنف حسنی صاحب نے مختصر اشارہ کیا ہے۔ آپ خود رجوع کریں اور ان کا موازنہ کریں۔ (۱)

عیسائی ... اور حدیث شق صدر

ابوریّہ کہتے ہیں کہ مذکورہ حدیث ایک اور حدیث کی تائید کرتی ہے جو بخاری، مسلم، فتح الباری اور دوسری کتب حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ بخاری میں صراحت کے ساتھ وہ حدیث یوں بیان ہوئی ہے۔ "کل بنی آدم یطعن الشیطان فی جنبیہ باصبعہ حین یولد غیر عیسی بن مریم، ذھب یطعن، فطعن فی الحجاب". (۲) یعنی حضرت عیسیٰ بن مریم کے علاوہ جو انسان بھی پیدا ہوتا ہے شیطان اس کے پہلو میں انگلی چبھوتا ہے لیکن جب اس نے حضرت عیسیٰؑ کے پہلو میں انگلی چبھونا چاہی تو ان پر پردہ آگیا اور شیطان کی انگلی پردے سے ٹکرا گئی۔

۱۔ سیرۃ المصطفیٰ ص ۳۶

۲۔ البخاری ج۲ ص ۱۴۳ ، طبع سال ۱۳۰۹ ہجری

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: "ما من بنی آدم مولود الا یمسہ الشیطان حین یولد، فیستھل صارخاً من مس الشیطان غیر مریم و ابنھا"۔ یعنی آدم کی اولاد میں سے کوئی بچہ بھی پیدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کی پیدائش کے وقت شیطان اسے چھوتا ہے جس کی وجہ سے نومولود رونے لگتا ہے لیکن حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے اس اصول سے منزہ ہیں۔

اسی حدیث کے مزید الفاظ بھی ذکر ہوئے ہیں جن کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ عیسائی حضرات اس روایت سے استدلال پیش کرتے ہیں کہ کوئی بھی انسان یہاں تک کہ کوئی نبی بھی معصوم نہیں بلکہ خطا اور لغزش اس سے سرزد ہو سکتی ہے لیکن صرف حضرت عیسیٰ بن مریم گناہ سے پاک تھے کیونکہ وہ شیطان کے مس کرنے سے محفوظ رہے تھے اور یہی امر حضرت مسیح کے مافوق بشر ہونے پر دلالت کرتا ہے اور ان کے لاہوتی وجود کو ثابت کرتا ہے۔ (۱)

ابوریہ مزید کہتے ہیں کہ: اگر مسلمان اپنے مسیحی بھائیوں سے یہ کہیں کہ، اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی غلطیوں کو اس کٹھن اور مشکل ذریعے کے علاوہ کسی اور ذریعے سے کیوں نہ بخشا جس کی وجہ سے اسے حضرت عیسیٰؑ کی پاکیزہ اور سالم روح جو بے گناہ تھی، کو اپنی طرف اٹھانا پڑا؟

وہ جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسولؐ کے قلب کو دوسرے انبیاء اور رسل کے قلوب کی طرح (البتہ خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے) اس سیاہ لوتھڑے اور شیطانی حصے کے بغیر کیوں خلق نہیں فرمایا تاکہ آپریشن کی ضرورت ہی پیش نہ آتی جس کی وجہ سے کئی دفعہ ان کا سینہ چیرنا پھاڑنا پڑا۔ (۲)

۱۔ اضواء علی السنة المحمدیة ص ۱۸۶ بحوالہ المسیحیة فی الاسلام چھاپ سوم ص ۱۲۷ تالیف ابراہیم لوقا۔

۲۔ اضواء علی السنة المحمدیة ص ۱۸۷

روایت کی بنیاد جاہلیت

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت اہل جاہلیت سے لی گئی ہے کتاب "اغانی" میں ایک افسانہ بیان ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے "امیہ بن ابی الصلت سو رہا تھا کہ دو پرندے آئے ایک گھر کے دروازے پر بیٹھ گیا اور دوسرا اندر چلا گیا اس نے امیہ کے دل کو پھاڑا اور پھر دوبارہ اسی جگہ پر رکھ دیا پہلے پرندے نے اس سے پوچھا: کیا اس نے پا لیا؟ دوسرے نے کہا: "ہاں"۔ پھر پہلے نے پوچھا: کیا "وہ پاک ہوگیا" اس نے جواب دیا: "اس نے پاکیزگی کو قبول نہیں کیا"۔

ایک اور روایت کے مطابق وہ اپنی بہن کے گھر گیا اور گھر میں کسی جگہ پر پڑے ہوئے تخت پر سو گیا اس کے بعد چھت پھٹی اور دو پرندے اندر داخل ہوئے ایک اس کے سینے پر بیٹھ گیا اور دوسرا اپنی جگہ پر کھڑا رہا جو سینے پر بیٹھا تھا اس نے اس کے سینے کو چیرا پھاڑا اور اس کے دل کو باہر نکالا۔ کھڑے ہوئے پرندے نے دوسرے سے پوچھا "کیا اس نے پالیا"؟ دوسرے نے جواب دیا: "ہاں" پھر سوال کیا: کیا اس نے قبول کر لیا؟ اس نے کہا: نہیں مسترد کر دیا ہے۔ پھر اس نے دل کو اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ یہ روایت امیہ کے بارے میں چار مرتبہ اسی سینہ پھاڑنے کے عمل کا تکرار کرتی ہے۔ (۱)

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت جعلی اور جھوٹی ہے اور یہ جھوٹ گھڑنے کا مقصد فاسد عقائد کی تقویت اور قرآن مجید کی صداقت اور ختمی المرتبت رسول اکرمؐ کی عصمت کو داغدار کرنا ہے۔

اب ہم دوبارہ اپنی گفتگو یعنی سیرہ پاک کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

۱۔ الاغانی ج ۴ ص ۱۸۸، ۱۸۹ اور ۱۹۰ کی طرف رجوع کریں۔

نبی اکرمؐ کی کفالت

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ نبی اکرمؐ اپنی ماں کے پیٹ میں یا اپنی چھوٹی عمر میں ہی اپنے والد ماجد کے سائے سے محروم ہو جائیں۔ بعض افراد کا نظریہ یہ ہے کہ پہلی بات زیادہ صحیح ہے، کیونکہ آپؐ یتیم تھے اور اسی وجہ سے حلیمہ سعدیہ نے آنحضرتؐ کی دایہ بننے سے اجتناب کیا تھا (۱) البتہ اس پر ہونے والے اعتراضات کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

اس کے بعد جب آنحضرتؐ بنی سعد کے قبیلے سے واپس آ گئے تو بعض روایات کے مطابق چار سال، بعض کے مطابق چھ سال اور بعض کے مطابق اس سے زیادہ عمر میں آپؐ کے سر سے والدہ کا سایہ بھی اٹھ گیا۔

مسلم اپنی کتاب صحیح میں نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: "استاذنت ربی فی زیارة امی، فاذن لی، فزوروا القبور تذکرکم الموت". (۲) یعنی میں نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کے لئے اپنے پروردگار سے اجازت طلب کی اور اس نے اجازت مرحمت فرمائی،

۱۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کشف الغمة ج ۱ ص ۱۶ میں ذکر ہوا ہے وہ قابل قبول نہیں ہے اس میں آیا ہے کہ آنحضرت (ص) نے اپنے والد گرامی کے ساتھ دو سال اور چار ماہ کا عرصہ گزارا۔ جبکہ اربلیؒ نے اسی کتاب کے صفحہ ۲۲ پر صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ آنحضرت (ص) ابھی ماں کے شکم مبارک میں تھے کہ آپ (ص) کے والد ماجد انتقال فرما گئے اس کے علاوہ تاریخ الخمیس ج۱ ص ۲۵۸، تاریخ الطبری ج ۲ ص ۳۳ اور سیرة ابن ھشام ج ۱ ص ۱۹۳ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۔ کشف الغمة ج ۱ ص ۱۶ مسلم سے منقول، صحیح مسلم ج ۳ ص ۶۵ ، ۱۳۳۴ ہجری میں چھاپ ہوئی اور یہ حدیث مختلف منابع میں موجود ہے جیساکہ کتاب الجنائز فی کتب الحدیث کی طرف رجوع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

تم بھی قبور کی زیارت کے لئے جایا کرو کیونکہ یہ تمہیں موت کی یاد دلاتی ہیں۔

یہ حدیث قبور کی زیارت سے منع کرنے والوں کے خلاف محکم دلیل ہے اس بات پر اور بھی بہت سے دلائل موجود ہیں مثلاً حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کا حضرت حمزہؓ کی قبر کی زیارت کرنا۔ علامہ محقق شیخ علی احمدی نے انبیاء اور صالحین کے آثار سے حصول برکت پر ایک کتاب تحریر کی ہے اس میں انہوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے اسی طرح علامہ امینی نے "الغدیر" میں، سبکی نے اپنی کتاب "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

اس کے بعد آنحضرتؐ اپنے دادا عبدالمطلب کی سرپرستی میں رہنے لگے وہ آپؐ کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اس حد تک کہ جب تک آنحضرتؐ موجود نہ ہوتے وہ کھانا تناول نہیں کرتے تھے۔ حضرت عبدالمطلب آپؐ کی نبوت سے آگاہ تھے اس سلسلے میں ایک روایت بھی نقل ہوئی ہے کہ جب آپؐ بچے تھے اور ابھی آپؐ نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا اور ایک شخص آپؐ کو ان سے دور کرنا چاہتا تھا تو انہوں نے فرمایا میرے بیٹے کو چھوڑ دو، ملک اس کے پاس آیا (۱) اور ظاہراً یہ روایت معتبر ہے۔

اسی بات کی مزید تائید اور تاکید کے لئے سیف بن ذی یزن سے پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں نقل ہونے والی وہ روایات جو یمن میں حضرت عبدالمطلب سے اس کی ملاقات کے موقع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور دلائل ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبدالمطلب کا ایمان بعض امور کی وجہ سے اور بھی راسخ ہوگیا تھا اور ان کے نزدیک آنحضرتؐ کو خاص مقام اور مرتبہ حاصل ہوگیا تھا۔

آنحضرتؐ جب آٹھ سال کے ہوئے تو آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلبؑ دار فانی کو الوداع کہہ گئے لیکن اپنی وفات سے پہلے انہوں نے آپؐ کی کفالت کی ذمہ داری حضرت

۱۔ اصول کافی ج ۱ ص ۴۴۷ طبع سال ۱۳۸۸ ہجری۔

ابوطالبؑ کے سپرد کر دی تھی اگرچہ حضرت ابوطالبؑ اپنے بھائیوں میں عمر میں چھوٹے تھے اور مالدار بھی نہیں تھے جبکہ بھائیوں میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑے حارث تھے اور سب سے زیادہ مالدار عباس تھے۔ لیکن اس وقت عباس کم سن تھے کیونکہ جیساکہ کہا جاتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ سے صرف دو سال بڑے تھے۔ (۱) اس کے علاوہ حضرت ابوطالبؑ اور آپؐ کے والد گرامی دونوں ایک ہی ماں سے تھے ان دونوں کی والدہ فاطمہ مخزومیہ تھیں لہذا قدرتی طور پر حضرت ابوطالبؑ آپؐ پر زیادہ مہربان، شفیق اور محبت کرنے والے تھے۔

بہرحال حضرت عبدالمطلب نے آنحضرتؐ کی سرپرستی کی ذمہ داری حضرت ابوطالبؑ کے سپرد کی کیونکہ وہ ان کی اولاد میں سب سے زیادہ شرافت مند اور معزز تھے اسی طرح قریش میں بھی وہ بلند مقام اور مرتبے پر فائز تھے۔ حضرت ابوطالبؑ نے رسالت مآبؐ کا نہایت اچھے طریقے سے خیال رکھا۔ ہمیشہ آپؐ کی عزت و تکریم کی اور آپ سے انتہائی محبت سے برتاؤ کیا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنی زبان اور طاقت کے ذریعے سے آپؐ کی نصرت کی۔ (جیساکہ ہم بعد میں اس کی طرف اشارہ کریں گے)۔

۱۔ اگرچہ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر عباس عمر کے لحاظ سے بڑے بھی ہوتے اور آپ (ص) کی کفالت کرنے کے قابل بھی ہوتے تب بھی حضرت عبد المطلب یہ ذمہ داری ان کو نہ سونپتے کیونکہ دولت کے حرص میں اس نے صرف حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری قبول کر رکھی تھی جبکہ ان کے کھانے اور خاطر تواضع کرنے سے انکار کیا۔ وہ ایسا شخص تھا جو مال و دولت کے حصول اور جمع کرنے میں جذبات سے کھیلتا تھا اور پیشہ ور مالداروں کا رویہ اپناتا تھا۔

بحیرا ... اور شام کا پہلا سفر

کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے چچا حضرت ابوطالب کے ہمراہ شام کا سفر اختیار کیا دوران سفر بصریٰ کے راہب بحیرا نے آپؐ کو دیکھا اور آپؐ کے چچا کو خبر دی کہ آپؐ اس امت کے نبی ہیں۔ بحیرا کا اصرار تھا کہ حضرت ابوطالب آپؐ کو واپس مکہ لے جائیں تاکہ آپؐ یہودیوں کے شر سے محفوظ رہیں کیونکہ یہودی آنے والے پیغمبرؐ کی اپنی کتب میں ثابت شدہ نشانیوں اور علامتوں کو آپؐ میں دیکھ کر کہیں آنحضرتؐ کو تکلیف نہ پہنچائیں پس حضرت ابوطالب نے وہیں قافلے کو چھوڑا اور واپس مکہ آگئے۔

جھوٹی روایت

ابو موسیٰ اشعری سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے کہ بحیرا انہیں مسلسل قسمیں دیتا رہا۔ آخرکار انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو واپس بھیج دیا اور ابوبکر اور بلال کو آپؐ کے ہمراہ کیا۔ نیز راہب نے کچھ روٹیاں اور زیتون کا تیل انہیں دیا۔ (۱)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ سات افراد رسول اکرمؐ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے انہیں بحیرا نے منع کیا پھر ان سب نے آپؐ کی بیعت کی اور آپؐ کے ہمراہ ہوگئے۔

لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ:

۱۔ الثقات لابن حبان ج ۱ ص ۴۳؛ البدایة و النہایة ج۲ ص ۲۸۵؛ تاریخ طبری ج۲ ص ۳۳ الاستقامة؛ تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۲۵۸؛ السیرة الحلبیہ ج ۱ ص ۱۲۰؛ مستدرک الحاکم؛ البیہقی؛ ابن عساکر اور ترمذی نے کہا حسن غریب. اسی طرح سیرة دحلان ج ۱ ص ۴۹ کہ آپ (ص) مکّہ واپس آگئے اور ان کے ہمراہ بلال اور ابوبکر تھے۔

۱۔ اس وقت آنحضرتؐ کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی بلکہ ایک قول کے مطابق نو سال تھی۔ (۱) اور ابوبکر پیارے نبیؐ سے مختلف اقوال کے لحاظ سے دو سال سے زیادہ چھوٹے تھے اور بلال ابوبکر سے بھی چند سال چھوٹے تھے۔ مختلف اقوال کی بنا پر یہ مدت پانچ سال سے لے کر دس سال تک ہے۔ (۲)

اس بنا پر کیا ابوبکر کے لئے ممکن ہے کہ وہ اس کم سنی میں شام کا سفر کرے اور پھر اس قسم کے اہم ترین مسائل ان کے سپرد کیے جا سکیں۔

اور کیا یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ بلال ایک شیرخوار جس نے ابھی چلنا بھی نہ سیکھا ہو یا پیدا ہی نہ ہوا ہو وہ ابوبکر کے ساتھ شام کا طولانی سفر کرے اور پھر حضور اکرمؐ کو بصریٰ سے واپس مکہ لانے کی ذمہ داری بھی قبول کرے جبکہ رسول اکرمؐ اس سے چند سال بڑے بھی تھے؟

۲۔ ابوبکر اور بلال کا آپس میں کیا تعلق بنتا ہے کہ ابوبکر اسے یہ حکم دیں؟ جبکہ بلال ابوبکر کے غلام نہیں تھے بلکہ وہ تو امیۃ بن خلف کے غلام تھے اور جیساکہ کہا جاتا ہے ابوبکر نے اس واقعے کے تیس سال بعد بلال کو اس سے خریدا۔ (۳)

۱۔ طبری ج۲ ص ۳۳، البدایۃ والنہایۃ ج۲ ص ۲۸۶، سیرۃ الحلبیۃ ج۱ ص ۱۲۰ اور کہا گیا ہے کہ صاحب کتاب الھدیٰ کے مصنف نے اس قول کو ترجیح دی۔

۲۔ ابن حبان اور الاصابۃ ج ۱ ص ۱۶۵ میں ابی نعیم سے ذکر کرتا ہے کہ بلال، ابوبکر کے ہم عمر تھے اور مشہور یہ ہے کہ وہ خود بلال سے چند سال بڑے تھے۔ اسی طرح سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۳۔ اس کی طرف حافظ دمیاطی نے تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۵۹ میں بحوالہ حیاۃ الحیوان اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح سیرۃ مغلطای ص ۱۱ پر بھی اس جملے کے اضافہ کے ساتھ "ماباعوہ علی ای شیئی"۔

البتہ یہ بات اس وقت درست ہے جب ہم یہ نہ کہیں کہ نبی اکرمؐ نے بلال کو خریدا اور پھر آزاد کیا تھا اور وہ کبھی بھی ابوبکر کی غلامی میں نہیں رہے تھے۔ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا انشاء اللہ سبحانہ و تعالیٰ۔

۳۔ اس حدیث کی نادرستی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے راوی ابو موسیٰ ہیں وہ اس وقت تک دنیا میں ہی نہ آئے تھے کیونکہ موؤخین کہتے ہیں کہ ابو موسیٰ آٹھ یا دس سال قبل از بعثت پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے سات ہجری میں جنگ خیبر کے سال میں مدینے کی طرف ہجرت کی۔ جبکہ یہ واقعہ تقریباً بعثت سے تیس سال پہلے وقوع پذیر ہوا۔ ان سب باتوں کے علاوہ ذہبی اس حدیث کے بارے میں کہتا ہے کہ میرا گمان ہے کہ یہ حدیث جعلی اور اپنے مدلول کے کچھ حصے کی وجہ سے باطل ہے۔ (۱)

شاید مندرجہ بالا تمام باتوں یا ان میں سے بعض باتوں کے پیش نظر ترمذی نے اس حدیث کو غریب (نامانوس) شمار کیا ہے اور ابن کثیر، دمیاطی اور مغلطای نے اس میں شک و تردید کا اظہار کیا ہے۔

حدیث گھڑنے کی وجہ

اس حدیث کو جعل کرنے کی وجہ ابوبکر کا نبی اکرمؐ کی نبوت پر ایمان کو بعثت سے پہلے ثابت کرنا ہے تاکہ ایمان لانے میں سب لوگوں پر ان کی سبقت ثابت کی جائے۔ یہاں تک کہ حضرت علیؑ اور حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا پر ان کی فضیلت ثابت کی جائے بلکہ ان معنوں میں تو خود رسول اکرمؐ پر بھی ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

نووی کہتا ہے کہ "ابوبکر نے بیس سال کی عمر میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور

۱۔ تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۵۹ اور سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۰۔

بعض کے بقول چندرہ سال کی عمر میں"۔ (۱)

صفوری شافعی کہتا ہے کہ "ابوبکر حضرت علیؑ کی ولادت سے پہلے اسلام لائے"۔ (۲)

دیار بکری بحیرا کے واقعے کے بارے میں ابن عباس سے ایک روایت نقل کرتے ہوئے اس کے آخر میں یوں ذکر کرتا ہے کہ "محمدؐ کے رسالت پر مبعوث ہونے سے پہلے ابوبکر کے دل میں آپؐ کی نبوت پر یقین اور ایمان پیدا ہوگیا تھا"۔ (۳)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس واقعے میں شریک بحیرا، بلال، حارث اور دوسرے افراد کو اسلام قبول کرنے میں سبقت لے جانے والوں میں کیوں شمار نہیں کیا اور یہ کہ ان سے پہلے کس نے ابوبکر کے دل میں اسلام کی خبر دی ہے؟

بحیرا کے واقعہ میں چند اشارے

واقعہ بحیرا میں قابل ذکر اور بحث طلب نکات بہت زیادہ ہیں لیکن ان سب کو یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور ان کے ذکر کرنے میں ہمیں کوئی زیادہ فائدہ بھی نظر نہیں آتا۔

گذشتہ گفتگو سے بعض روایات کی صحت اور درستی کا اندازہ ہو جاتا ہے جو یہ کہتی ہیں کہ ابوبکر یا آپؐ کے چچا حارث رسول اللہ کے پاس گئے، آپؐ کو گود میں اٹھایا اور دوسروں کے ساتھ بحیرا کے دسترخوان پر آپؐ کو بٹھا دیا اور ابن محدث اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ رسول اکرمؐ کو لانے والا ابوبکر تھا نہ کہ آپؐ کے چچا۔ (۴)

۱۔ الغدیر ج ۷ ص ۲۷۲

۲۔ نزھۃ المجالس ج ۲ ص ۱۳۷

۳۔ تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۶۱

۴۔ السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۱۹ اور السیرۃ النبویۃ لدحلان ج ۱ ص ۳۸

گویا ابن محدث اس بات کو نہیں جانتا کہ ابوبکر سرے سے اس سفر میں تھے ہی نہیں۔ جیساکہ دمیاطی اور مغلطای نے یہی بات صراحت سے ذکر کی ہے۔ (۱) اور اگر بالفرض وہ سفر میں موجود بھی تھے تو بھی عمر کے لحاظ سے آنحضرتؐ سے چھوٹے تھے جیساکہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس واقعے سے مربوط بعض روایات کے راوی اس میں متردد ہیں کہ آنحضرتؐ کا شام کی طرف یہ سفر حضرت ابوطالبؑ کے ساتھ تھا یا آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلبؑ کے ہمراہ۔ (۲)

اس صورت میں مذکورہ روایت جو یہ کہتی ہے کہ یہ سفر ابوبکر اور بلال کے ساتھ تھا مزید مورد اعتراض واقع ہوتی ہے اور اس کی نارسائی مزید واضح ہو جاتی ہے کیونکہ جب حضرت عبدالمطلب کی وفات ہوئی تو اس وقت نبی اکرمؐ کی عمر مبارک آٹھ سال تھی جیساکہ گزر چکا ہے۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ مکے کی طرف واپسی کے سفر میں آنحضرتؐ کے ساتھ صرف آپؐ کے چچا حضرت ابوطالبؑ تھے۔ (۳) (جیساکہ ذکر ہوچکا ہے) آپؐ کے ہمراہ ابوبکر تھے نہ کوئی اور۔

رسول اکرمؐ نے تجارت کی غرض سے شام کا ایک اور سفر بھی اختیار کیا جس کا ذکر ہم بہت جلد کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

۱۔ سیرۃ مغلطای ص ۱۱، تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۵۹ حافظ دمیاطی

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۲۰ طبع صادر اور ج ۱ قسم ۱ ص ۷۶ طبع لیدن اور البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۸۶

۳۔ الحافظ عبدالرزاق کی کتاب المصنف ج ۵ ص ۳۱۸ اور سیرۃ ابن ھشام ج ۱ ص ۱۹۴

حضور اکرمؐ کی جنگ فجار میں شرکت

مورخین لکھتے ہیں کہ حرام مہینوں (یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم الحرام اور رجب المرجب) میں قبیلہ قیس اور قریش و کنانہ کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔ اسی وجہ سے اس کا نام جنگ فجار (یعنی بہت بڑا گناہ) رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے بھی کچھ دن عملی طور پر اس جنگ میں شرکت کی۔

ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر اس میں بہت زیادہ شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں:

۱۔ جنگ فجار حرام مہینوں میں سے ماہ رجب میں لڑی گئی اور ہم کہیں بھی نہیں دیکھتے کہ حضرت ابوطالب اور رسول خداؐ نے ان مہینوں کی حرمت کو پامال کیا ہو۔ جیساکہ ان دو حضرات کی سیرت اور زندگی کا مطالعہ کرنے والے شخص پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں ہستیاں ایسے کاموں میں ملوث نہیں تھیں بلکہ ان سے سختی سے اجتناب کرتی تھیں۔ آپ دونوں دین حنیف پر قائم تھے بلکہ کافی کی بعض روایات یہ بتاتی ہیں کہ انبیاء کی وصیتیں امانت کی شکل میں حضرت ابوطالبؑ کے پاس تھیں۔ الغدیر اور اس طرح کی دوسری کتب جن میں حضرت ابوطالبؑ کا ذکر کیا گیا ہے، میں ان کی عظمت اور دین میں ثابت قدمی پر اور بھی بہت سے دلائل موجود ہیں۔

ہاں اسکی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جنگ فجار غیر حرام مہینوں میں لڑی گئی یا یہ کہ اس کے اسباب حرام مہینوں میں وجود میں پیش آئے جبکہ یہ خود شعبان یا شوال میں لڑی گئی۔ (۱) لیکن یہ تاویل ناقابل اعتماد ہے اور تاریخی لحاظ سے اسکی کوئی سند بھی نہیں ہے۔

۱۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۸ کی طرف رجوع کریں۔ اس میں ہے کہ جنگ فجار کے اسباب حرام مہینوں میں فراہم ہوگئے تھے لیکن خود جنگ شعبان میں لڑی

۲۔ ابن واضح المعروف یعقوبی کہتے ہیں: روایت ہے کہ حضرت ابوطالبؑ نے سب بنی ہاشم کو اس (یعنی جنگ فجار) میں شرکت کرنے سے منع کیا اور کہا کہ یہ ظلم و تعدی، قطع رحم اور حرام مہینوں کو حلال قرار دینا ہے۔ میں اور میرے خاندان میں سے کوئی اس میں شریک نہ ہوگا۔ لیکن زبیر بن عبدالمطلب مجبور ہو کر اس میں شریک ہوا نیز عبد اللہ بن جدعان تیمی اور حرب بن امیہ نے کہا کہ جس کام میں بنی ہاشم شریک نہیں ہوں گے ہم بھی اس میں شرکت نہیں کریں گے۔ (۱)

۳۔ اس جنگ میں آنحضرتؐ کی شرکت سے مربوط روایات میں آپؐ کے جنگ میں کردار کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض روایات یہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اکرمؐ کا کام فقط اپنے چچوں کو تیر دینا تھا۔ آپؐ دشمن کے تیر جمع کر کے انہیں دیتے اور ان کے سامان کی حفاظت کرتے تھے۔ (۲)

کچھ اور روایات بتاتی ہیں کہ آپؐ نے چند تیر چلائے اور آپؐ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ آپؐ ایک تیر بھی نہ چلائیں۔ (۳)

روایات کی تیسری قسم یہ کہتی ہے کہ آپؐ نے نیزے کے ساتھ ابو براء کو گھوڑے سے گرایا۔ یہ شخص مسخرہ تھا۔ آنحضرتؐ کی عمر اس وقت چودہ سال کی تھی (۴) یا آپؐ بالکل

گئی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے پھر جنگ فجار کا نام کیوں دیا گیا؟ اس اضافے کے ساتھ کہ جنگ کی تاریخ کے حوالے سے یعقوبی صراحت کے ساتھ ماہ رجب میں جنگ کے وقوع پذیر ہونے پر زور دیتا ہے۔

۱۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۵ طبع صادر

۲۔ سیرۃ ابن ھشام ج ۱ ص ۱۹۸ اور تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۵۹

۳۔ السیرۃ النبویۃ لدحلان ج ۱ ص ۵۱ اور السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۷

۴۔ مندرجہ بالا حوالے

نوجوان تھے (۱) اور ہم نہیں جانتے کہ کیا عرب ایک نوجوان کو معرکہ جنگ میں وارد ہونے کی اجازت دیتے تھے یا نہیں۔

بلکہ بعض افراد سے اس بارے میں متضاد باتیں نقل ہوئی ہیں پس جب یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی ولادت عام الفیل میں ہوئی اور جنگ فجار میں آپؐ نے چودہ سال کی عمر میں شرکت کی اور پھر آخر میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنگ فجار عام الفیل کے بیس سال بعد وقوع پذیر ہوئی تو ان بیانات سے ایک تضاد سامنے آتا ہے۔ (۲)

یہاں پر ایک اور تضاد بیان کیا جاتا ہے جو یعقوبی کے کلام کے دوسرے حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حرب بن امیہ نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری روایات اسکی موجودگی پر اور وہ بھی قریش اور کنانہ کی قیادت کی صورت میں دلالت کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اور بھی اعتراضات ہیں لیکن یہاں انہیں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

جعلی روایات کا کھیل

آخری تضاد ایک قابل توجہ نکتہ ہے کیونکہ اگر مذکورہ اختلاف لشکر کے کسی عام شخص کے بارے میں ہوتا تو ممکن تھا کہ بعض لوگ اسے جنگ میں حاضر سمجھتے اور بعض غائب جانتے اور اس کے لئے تاویلیں بھی کی جاسکتی تھیں اور چہ بسا یہ کہا جاتا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

لیکن یہاں اختلاف کی یہ صورت ہے کہ ایک کہتا ہے کہ وہ جنگ میں موجود اور لشکر کا سردار تھا جبکہ دوسرا کہتا ہے کہ وہ بالکل جنگ میں موجود ہی نہیں تھا۔ ایسے مورد میں اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا یہاں فقط جھوٹ باندھا گیا ہے۔

۱۔ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص ۱۶ طبع صادر

۲۔ تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۵۹ اور سیرۃ ابن ھشام ج ۱ ص ۱۹۵ اور ۱۹۶

شاید اس کا مقصد حرب ابن امیہ کو ایسی جنگ سے دور رکھنا ہو جس میں ظلم و ستم ہو، قطع رحم ہو اور جو حرام مہینوں میں لڑی گئی ہو، اگرچہ یہ بات تمام مورخین کے اقوال کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ حرب ابن امیہ ایک ایسا شخص تھا جس کی فضیلت اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے (بنی امیہ کی) حکومت کوشاں رہتی تھی خواہ وہ جھوٹ اور افتراء کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن آنحضرتؐ کے بارے میں ایسی باتوں کے پیچھے ایک سازش کار فرما تھی جس کا مقصد اس چیز کے برعکس تھا جو حرب بن امیّہ کے بارے میں جھوٹ گھڑنے میں پیش نظر تھی۔ اس وجہ سے یہ ملاحظہ کیا جاتا ہے کہ ان کی کوشش یہ ظاہر کرنے پر مرکوز تھی کہ رسول اکرمؐ نے جنگ فجار میں شمولیت اختیار کی اور اس پر خوش تھے جبکہ یہ جنگ حرمت والے مہینوں میں لڑی گئی اور اس میں ظلم و ستم اور قطع رحم روا رکھا گیا اور حرام مہینوں کی حرمت پامال کی گئی۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے کچھ تیر بھی چلائے اور آپؐ اس بات پر راضی نہ تھے کہ آپ ایک تیر بھی نہ چلائیں۔

حلف الفضول (۱)

قریش کے جنگ فجار سے دستبردار ہونے کے بعد زبیر بن عبدالمطلب (۲) نے لوگوں کو ایک معاہدے کی دعوت دی جسے حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔ تمام شرکاء جلسہ نے اپنے ہاتھ آب زمزم میں

۱۔ ایسے معاہدے کو "حلف الفضول" کہے جانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس میں شریک متعدد افراد کا نام "فضل" تھا۔ (مترجم)

۲۔ اور یہ زبیر بن عوام کے علاوہ ہے جس نے جمل میں حضرت علیؑ کے خلاف جنگ کی اور مارا گیا۔

ڈال کر مظلوموں کی حمایت، معاشی امور میں باہمی امداد اور نہی عن المنکر کرنے کی قسم اٹھائی اور عہد کیا۔ یہ بہترین عہد و پیمان تھا۔

اس معاہدے میں شریک افراد میں بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی اسد بن عبد العزی زھرۃ اور تیم شامل تھے۔ (۱)

اس عہد و پیمان میں رسول اکرمؐ بھی شریک تھے اور آپؐ نے نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد اس کی تائید اور تعریف فرمائی۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میں پسند نہیں کرتا کہ حلف الفضول میں شرکت کا کسی اور چیز سے معاوضہ لوں حتی کہ سرخ بالوں والے اونٹ بھی نہیں لوں گا اگر اب بھی اس کے لئے مجھے بلایا جائے تو میں اس دعوت کو قبول کروں گا"۔ یا آپؐ نے اس سے ملتی جلتی کوئی بات کی۔ (۲)

حلف کا سبب

اس حلف کا موجب قبیلہ زبید کے ایک شخص کا واقعہ ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ مذکورہ شخص مکے میں اپنا مال لے کر آتا ہے، وہ مال اس سے عاص بن وائل خرید لیتا ہے لیکن اس کا معاوضہ ادا نہیں کرتا ہے۔ زبیدی نے حلیفوں سے مدد طلب کی جو خون چاٹنے

۱۔ شرح نہج البلاغہ معتزلی ج۱۴ ص ۱۲۹ اور نسب قریش مصعب ص ۲۸۳، اس نے دونوں قسموں کی تشریح کی ہے ایک پیمان احلاف خون چاٹنے والوں کے لئے اور دوسرا حلف مطیبین اور بدایہ و نہایہ ج ۲ ص ۲۹۳۔

۲۔ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۱۳، سیرۃ ابن ھشام ج ۱ ص ۱۳۲، بدایۃ و نہایۃ ج ۲ ص ۲۹۳ اور ۲۹۱، تاریخ خمیس ج ۱ ص ۲۶۱، سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۱۳۱ اور سیرۃ نبویۃ دحلان ج ۱ ص ۵۳۔

والوں کے نام سے مشہور تھے کیونکہ انہوں نے حلف اٹھاتے وقت مطیبین کے برخلاف جن کا ذکر گزر چکا اپنے ہاتھ خون میں ڈبوئے تھے جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا تھا۔ احلاف یہ تھے بنی عبد الدار، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی سہم اور بنی عدی بن کعب ...۔

حلیفوں نے زبیدی کی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور اسے اپنے سے دور کر دیا جب زبیدی نے یہ صورت حال دیکھی تو ابوقبیس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور اس نے فریاد بلند کی یہ منظر دیکھ کر زبیر بن عبدالمطلب سخت متاثر ہوا اور اس نے چند افراد کو مذکورہ پیمان کی دعوت دی۔ آخرکار یہ عہد و پیمان باندھا گیا اس کے بعد ان لوگوں نے عاص کی خبر لی اور اس سے زبیدی کا مال لے کر اس کے حوالے کیا۔ (۱)

بنو امیہ اور حلف الفضول

اس پیمان کے وقت بنوامیہ کی موجودگی کے بارے میں ابوہریرہ نے جو کچھ کہا اس کا کسی اور نے کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ بہت سے مورخین نے اسکی بات کو رد کیا ہے (۲) اسی طرح بعض افراد کا یہ بھی قول ہے کہ اس عہد و پیمان کی دعوت دینے والے ابوسفیان اور عباس بن عبدالمطلب تھے، (۳) یہ بات درج ذیل دلائل کی روشنی میں قابل قبول نہیں ہے۔

۱۔ البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۹۱ اور ۲۹۲، السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۲، السیرۃ النبویۃ دحلان ج ۱ ص ۵۳۔

۲۔ البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۹۱، السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۱، دحلان کی السیرۃ النبویۃ ج ۱ ص ۵۳ اور بیہقی کی السنن الکبری۔

۳۔ السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۲ اور دحلان کی سیرۃ النبویۃ ج ۱ ص ۵۳ جیساکہ اس عہد و پیمان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے اس وقت عباس کی عمر اٹھارہ سال تھی لہذا وہ اس قسم کی دعوت دینے کی پوزیشن میں تھے۔

اول: یہ عہد و پیمان امویوں کے خلاف تھا اس کا سبب عمرو عاص کا باپ عاص بن وائل سہمی تھا جو امویوں کا حلیف تھا لہذا ابوسفیان کی اس میں شرکت معقول نہیں ہے چہ جائیکہ وہ اس کی دعوت دینے والا ہو۔

دوم: کہا گیا ہے کہ محمد بن جبیر بن مطعم، عبداللہ بن زبیر کے قتل کے وقت عبدالملک کے پاس پہنچا۔ عبدالملک نے اسے کہا اے ابو سعید! کیا ہم اور آپ یعنی عبد شمس بن عبد مناف اور بنی نوفل بن عبد مناف حلف الفضول میں شریک نہیں تھے؟ اس نے جواب دیا تم بہتر جانتے ہو۔ عبدالملک نے کہا اے ابو سعید! مجھے حقیقت حال سے آگاہ کرو۔ اس وقت ابو سعید نے کہا "خدا کی قسم ہم اور آپ اس سے خارج ہیں"۔ عبدالملک نے اس کی تصدیق کی۔ ابن ابی الحدید معتزلی نے ابن جبیر کے جواب کو اس اضافے کے ساتھ ذکر کیا ہے "ہم نے اور آپ نے جاہلیت اور اسلام کے ادوار میں ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور اکھٹے رہے ہیں"۔ (۱)

سوم: درج ذیل واقعات سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنی امیہ اس حلف الفضول میں شریک نہیں تھے اور اسلام نے اس پیمان کا اعتراف کیا اور اسے قبول کیا ہے۔

الف: امام حسینؑ اور ولید بن عتبہ اموی جو اپنے چچا معاویہ کی طرف سے مدینے کا حاکم تھا، کے درمیان ایک مال پر تنازع پیدا ہوگیا، یہ مال امام حسینؑ کا تھا گویا کہ ولید نے اپنی طاقت و قدرت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے امام حسینؑ کا حق غصب کر لیا تھا۔ امام حسینؑ نے کہا خدا کی قسم یا تم میرا حق انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے یا میرے حوالے کر دوگے یا پھر میں تلوار لیکر مسجد النبیؐ میں قیام کرونگا اور لوگوں کو حلف الفضول کی دعوت دونگا۔ لوگوں کی ایک جماعت نے امام حسینؑ کی آواز پر لبیک کہا ان میں قبیلہ اسد بن

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۳۳ اور شرح نہج البلاغہ معتزلی ج ۱۵ ص ۲۲۶ میں زبیر بن بکار سے منقول ہے۔

عبدالعزیٰ کے عبداللہ بن زبیر، مسور بن مخرمۃ الزہری اور عبدالرحمن بن عثمان تیمی شامل تھے۔ جب یہ خبر ولید تک پہنچی تو اس نے امام حسینؑ کا حق لوٹا دیا اور انھیں راضی کیا۔ (۱)

ب: ھلال عسکری کی تصریح کے مطابق "امام حسینؑ اور معاویہ کے درمیان زمین کے ایک ٹکڑے پر جو امام حسینؑ کی ملکیت تھا تلخ کلامی ہوگئی۔ امام حسینؑ نے ابن زبیر سے کہا کہ اسے تین کاموں میں سے ایک کا اختیار ہے وگرنہ چوتھی فیصلہ کرنے والی چیز تلوار ہے اور وہ تین کام یہ ہیں یا تو وہ تجھے یا ابن عمر کو میرے اور اس کے درمیان ثالث بنائے یا وہ میرے حق کا اقرار کرے اور پھر مجھ سے اس زمین کی درخواست کرے یا پھر مجھ سے خرید لے اور اگر وہ پس و پیش سے کام لے تو مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں ضرور حلف الفضول کی بنیاد پر اپنے حلیفوں کو پکاروں گا۔ (۲)

ج: ابو الفرج نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے آخر میں یہ ذکر ہے کہ جب معاویہ نے امام حسن مجتبیٰؑ پر اپنی برہمی کا اظہار کیا کیونکہ وہ مدینے میں موجود ہونے کے باوجود معاویہ سے ملنے نہیں آئے تھے تو اس وقت ابن زبیر نے اسے امام حسنؑ کے قتل پر اکسایا لیکن معاویہ نے اس کی بات کو ٹھکرا دیا۔ پھر ابن زبیر نے یہ کہا کہ "خبردار رہو خدا کی قسم میں اور وہ حلف الفضول میں تمہارے خلاف متحد ہوں گے"۔ معاویہ نے جواب دیا، تو کون ہے؟ "خدا کی قسم مجھے تجھ سے سروکار ہے نہ حلف الفضول سے" (۳) یہ نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آئمہؑ نے رسول اللہؐ کی پیروی کرتے ہوئے حلف الفضول کو

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۲، سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۲، کامل ابن اثیر (طبع صادر) ج ۲ ص ۴۲، بدایۃ و نہایۃ ج ۲ ص ۲۹۳، دحلان کی سیرۃ النبویہ ج ۱ ص ۵۳ (سیرۃ حافظ دمیاطی کے حوالے سے) اور انساب الاشراف ج ۲ ص ۱۴۔

۲۔ الاوائل ج ۱ ص ۷۳ اور ۷۴

۳۔ الاغانی ج ۸ ص ۱۰۸ طبع ساسی

قبول کیا اور اسکی تائید کی، جیساکہ پہلے ذکر ہوا۔ اسی طرح یہ اسناد خصوصاً آخری روایت اس امر پر بھی گواہی دیتی ہیں کہ معاویہ اور اسکا خاندان حلف الفضول میں شریک نہیں تھا کیونکہ ابن زبیر اسے حلف الفضول کی دھمکی دیتا اور اسی طرح امام حسینؑ کا اس حلف کیلئے پکارنا اور زبیریوں اور دیگر افراد کا امویوں کے خلاف جمع ہوجانا بھی اسی بات کو ثابت کرتا ہے۔

اس گذشتہ گفتگو سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ابو ہریرہ اور اس جیسے دوسرے افراد اپنے ظالم آقاؤں کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لئے جس بات کو ثابت کرنا چاہتے تھے وہ ایک ایسی بات ہے جس کی تکذیب تاریخی وقائع اور مورخین کے اقوال سے ہوتی ہے۔

لیکن ابو ہریرہ کی یہ بڑی خواہش تھی کہ بنوامیہ ایسی فضیلت سے محروم نہ رہیں، اس خواہش نے اسے مجبور کیا کہ وہ عربوں کے بہترین پیمان میں امویوں کو شریک کرے وہ پیمان جسکی اسلام اور شریعت نے تائید کی ہے اور وہ فطرت اور عقل سلیم سے بھی ہم آہنگ ہے۔

قابل توجہ نکتہ: آخر میں ہم یہ ملاحظہ کرتے ہیں کہ بعض افراد رسول اکرمؐ سے ایسی باتیں نقل کرتے ہیں جو جاہلیت کے پیمانوں سے متمسک رہنے کو ضروری قرار دیتی ہیں (۱) اس کے پیچھے کوئی غرض کارفرما ہے اور یہ خبیث حرکت ہے۔ ہاں اگر ایسی روایتوں کا مورد نظر حلف الفضول ہو تو درست ہے کیونکہ اسلام نے اس کی تائید کی ہے۔ یا ان کے پیش نظر ایسا پیمان ہو جو اسلام کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو تو بھی صحیح ہے مثلاً حضرت عبدالمطلب کا بنی خزاعہ سے پیمان اور جب قریش نے بنی خزاعہ کے افراد کو قتل کیا تو انہوں نے اسی پیمان کی بنیاد پر آنحضرتؐ سے مدد طلب کی تھی۔ اور جیساکہ ہم اشارہ کریں گے فتح مکہ کا واقعہ اسی وجہ سے وقوع پذیر ہوا۔

۱۔ حافظ عبدالرزاق کی کتاب المصنف ج۱۰ ص ۳۰۶ و ۳۶۰ اور اسکے مسلم اور ترمذی کے حاشیہ کی ج۴ ص ۱۳۶ طبع مکتبۃ الاسلامیۃ اور اسی طرح سعید بن منصور اور فتح الباری ج۸ ص ۱۶۳ اور الدارمی کے حوالے سے۔

حلف الفضول کے بارے میں چند اہم نکات

ا۔ امام حسینؑ اس وقت کے حالات اور نفسیاتی کیفیات کی بنیاد پر یہ جانتے تھے کہ ان کی دعوت کا بہت بڑا فائدہ حاصل نہیں ہوگا لیکن انہوں نے حلف الفضول کے لئے لوگوں کو پکارا اس سے آپؑ کا ہدف یہ تھا کہ لوگ بنی امیہ کی حقیقت کو پہچان لیں اور وہ جان لیں کہ یہ ایک ظالم اور ستمگر خاندان ہے اور ان کا مطلوب صرف دنیا ہے۔ اور لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوجائے کہ خاندان ہاشم اور اہل بیتؑ مظلوموں کے حامی اور حق کی حمایت کرنے والے ہیں۔ معاویہ اس بات سے ڈر گیا اور وہ امام حسینؑ کے آگے جھک گیا اور حق، اہل حق کو واپس کر دیا۔ یہ بات ہم نے ایک محقق کے حوالے سے بیان کی ہے۔ (۱)

علاوہ ازیں حلف الفضول کی طرف دعوت ایسے حالات میں دی گئی جب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا اور اس مفسد ٹولے کی نابودی کے لئے عوامی تحریک چلانے اور عوام کے ذریعے سے انقلاب لانے کا بھی موقع نہیں تھا کیونکہ اس موقع پر اور ان حالات میں عوامی تحریک چلانے کی صورت میں امام حسینؑ مورد الزام ٹھہرائے جاتے اور ان کے اس اقدام کی یہ تفسیر کی جاتی کہ وہ ذاتی مفادات کے حصول کے لئے ایسا کر رہے ہیں اور اس کا دین اور امت کے دفاع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لہذا اس دلیل کی بنا پر ایسے حالات اور صورت حال میں اگر امام حسینؑ شہید ہوتے تو آپؑ کی شہادت سے دین اور امت کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا بلکہ فائدے کی بجائے نقصان کا اندیشہ زیادہ تھا کیونکہ معاویہ بہت عیار تھا وہ اس کے بعد اپنے گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعے امت کی امیدوں کو آئمہ علیہم السلام سے قطع کر دیتا اور مسلمانوں کو روحانی اور فکری لحاظ سے اہل بیتؑ اور آئمہؑ سے خصوصاً دور کر دیتا اور ان کے درمیان فاصلے ایجاد کر دیتا۔

۱۔ وہ عظیم محقق سید مہدی روحانی ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ جن حالات سے گزر کر معاویہ اقتدار تک پہنچا تھا ان سے اگرچہ اہل عراق اور اہل حجاز کی اکثریت واقف تھی لیکن اہل شام اس سے بے خبر تھے کیونکہ وہ صرف سفیانی اسلام سے آشنا تھے وہ اسلام جس کا مطمح نظر ذاتی اغراض و مقاصد اور مفادات کا حصول تھا اور جو ذاتی اہداف تک پہنچنے کے لئے ہر چیز کو حلال سمجھتا تھا۔

شامیوں کی صحیح اسلامی خطوط پر تربیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ علیؑ اور اہلبیتؑ کی حقیقت سے نا آگاہ تھے انہیں علیؑ کے اسلام، علیؑ کے اصولوں اور اہداف کا ادراک نہیں تھا جبکہ دوسری طرف اموی اپنے آپ کو رسول اللہ (ص) کے رشتہ دار اور اہل بیت ظاہر کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کے روساء اور بزرگوں میں سے دس اشخاص نے یہ دعوی کیا کہ ہم بنی امیہ کے علاوہ کسی اور کو نبی اکرمؐ کے اہلبیت کے طور پر نہیں جانتے (۱) بلکہ معاویہ تو اس حد تک گستاخی پر اتر آیا تھا کہ وہ اہل شام سے کہتا تھا کہ علیؑ تو نماز بھی نہیں پڑھتے۔ (۲)

اس صورت حال میں اور اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے اہل شام واقعات کی اصل

۱۔ مقریزی کی کتاب النزاع و التخاصم ص ۲۸، معتزلی کی شرح نہج البلاغہ ج ۷ ص ۱۵۹، مروج الذھب ج ۳ ص ۳۳ اور ان کے رسول اللہ کی قرابت کی بنا پر دعوی خلافت کے لئے، العقد الفرید ج ۲ ص ۱۲۰ طبع دار الکتاب العربی کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسی طرح مؤلف کی کتاب حیاۃ الامام الرضا السیاسیۃ کے صفحات ۵۴ اور ۵۵ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ الفتوح از ابن اعثم ج ۳ ص ۱۹۶، نصر بن مزاحم کی کتاب وقعۃ صفین ص ۳۵۴، ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ ج ۸، ص ۳۶، ابن اثیر کی الکامل ج ۳ ص ۳۱۳، تاریخ طبری ج ۴ ص ۳۰ اور الغدیر ج ۹ ص ۱۲۲ بعض قدیمی کتابوں کے حوالے سے۔

حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے تھے بلکہ معاویہ اپنی مکروہ شیطنیت کے بل بوتے پر غیر اہل شام کے لئے بھی حقائق کو پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ معاویہ عمر بن خطاب کی طرف سے شام کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ عرب حضرت عمر کے ارادت مند اور محب تھے کیونکہ انھوں نے عربوں کے غرور کو جلا بخشی، بیت المال کی تقسیم اور دیگر امور میں عربوں کو دیگر اقوام پر ترجیح دے کر انھوں نے عربوں کی شخصیت اور حیثیت کو بلند کیا۔ یہ وہی عرب تھے جن کی کل تک کوئی اہمیت نہیں تھی وہ خشک و بیابان صحراء میں سرگرداں تھے۔ نامطلوب غذا کھاتے اور گدلا پانی پیتے تھے اور دوسری گھٹیا خصوصیات کے حامل تھے جن کا پہلی فصل میں ذکر کیا گیا ہے۔

جب اسلام آیا تو اس نے انھیں دوسروں کے برابر سمجھا اور ان کے عزت و وقار کو بلند کیا اور عزت و بزرگی کا معیار تقوی کو قرار دیا۔ لیکن حضرت عمر بن خطاب کی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ہر قسم کے امتیازات کو صرف عربوں کے لئے مخصوص کرے اور غیر عربوں کو ہر چیز سے محروم کرے اسی وجہ سے عرب انھیں بہت چاہتے تھے اور ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے ان کا کردار اور گفتار ان کے لئے ایک قانون کی حیثیت رکھتا تھا جس کی مخالفت کرنا ہرگز ممکن نہیں تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی اقدام کیا جا سکتا تھا۔ اس بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ جس شخص کو بھی کسی علاقے کا حاکم بناتے تھے اس سے اس شخص کی عزت و وقار میں اضافہ ہوتا تھا اور اسے ایک خاص مقام حاصل ہو جاتا تھا جیساکہ ابن حیان نے اپنی کتاب الثقات ج ۲ ص ۲۹۵ میں نقل کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس حضرت علیؑ جو بنی اسماعیل کی بنی اسحاق پر کسی قسم کی برتری کے قائل نہیں تھے (۱)۔ "شریح" کو قاضی کے منصب سے معزول نہ کر سکے کیونکہ اسے حضرت عمر نے قاضی مقرر کیا تھا اسی طرح فوج کو نماز تراویح پڑھنے سے روکنے میں کامیاب

۱۔ سنن البیہقی ج ٦ ص ۳۴۹ اور الغدیر ج ۸ ص ۲۴۰

نہیں ہوسکے تھے کیونکہ حضرت عمر نے اس کا حکم دیا تھا بلکہ لوگ علیؑ کے سامنے شور مچاتے تھے کہ ہم حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی سنت چاہتے ہیں۔ (۱) جس کو حضرت عمر حاکم بناتا وہ لوگوں کے درمیان مقام و عظمت کا حامل بن جاتا اور اسی پر ان کو اعتماد ہوتا۔ ان کے علاوہ ایسے اور بہت سے شواہد ہیں جو ان اثرات کی حکایت کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب بنی امیہ برسراقتدار آ گئے تو انہوں نے عمر کی سنت اور سیرت پر عمل کیا اور انہی کو سیاسی اور غیر سیاسی امور میں اپنا آئیڈیل (ideal) قرار دیا۔

جب معاویہ حضرت عمر کی طرف سے شام کا حاکم بنا اور اس نے قتل عثمان کے انتقام کا پرفریب نعرہ لگایا اور لوگوں کے درمیان بہت سے شبہات ایجاد کر دیئے یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوگیا کہ رسول اعظمؐ کے بعد عظیم ترین انسان علیؑ کے خلاف صفین کے میدان میں جنگ کرنے کے لئے ایک بڑے لشکر کی قیادت کر سکے۔

اسی طرح جب معاویہ "تحکیم" کے واقعے سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوگیا اور یوں اس نے اپنی حکومت پر شرعی رنگ چڑھا لیا جس کے ذریعے سے وہ سادہ لوح عوام کو فریب اور دھوکا دینے کے قابل ہوگیا تھا تو جب وہ ان پیچیدہ حالات میں اقتدار کو حاصل کر سکتا تھا تو طبیعی طور پر اس کے لئے یہ بات بہت آسان تھی کہ وہ حسین بن علیؑ کو شہید کرنے کے بعد انہیں ایک باغی، ظالم، لالچی اور ذاتی مفادات کی خاطر جنگ کرنے والے شخص کے طور پر لوگوں میں مشہور کر دیتا بلکہ العیاذ باللہ انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیتا۔

ان خاص حالات میں معاویہ مختلف شہروں میں خفیہ طور پر مقرر کئے گئے اموی مبلغین اور خطباء کے ذریعے سے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ حجاز، عراق اور شام میں بہت سوء استفادہ کر سکتا تھا خصوصاً شامی عوام کے بارے میں حقائق اور حقیقت حال سے آگاہی اور علم کے لئے اموی ذرائع ابلاغ کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ معاویہ وہ شخص تھا جس نے

۱۔ الکامل للمبرد ج ۱ ص ۱۴۴ طبع دار النہضۃ مصر۔

حق و باطل کو اس حد تک مخلوط کر دیا تھا کہ اس بات نے مولا علیؑ کو کنارہ گیری پر مجبور کر دیا تھا۔

مزید برآں یہ کہ حضرت علیؑ سے پہلے خلفاء کے زمانے میں خاص سیاسی مقاصد کے پیش نظر بزرگ صحابہ کے گرد ایک حصار بنا دیا گیا تھا انہیں مختلف شہروں میں پھیل جانے کا موقع نہ دیا گیا تاکہ وہ نبی اکرمؐ کی تعلیمات کو صحیح طور پر لوگوں میں پھیلا نہ سکیں بلکہ انہیں لمبی مدت تک مدینہ میں محبوس رکھا گیا اور اگر کوئی ان کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے کلمہ حق بیان کیا تو اسے طرح طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا جیساکہ حضرت ابوذرؓ سے یہ سلوک روا رکھا گیا۔ (۱)

اس صورت حال میں اصحاب کے سینوں میں جو کچھ تھا وہ اس کے اظہار و بیان سے عاجز تھے یہاں تک کہ اصحاب کا طبقہ آہستہ آہستہ دنیا سے چل بسا۔ اس صورت حال کے باعث حکمران ٹولے کو اہلبیتؑ اور نبی اکرمؐ بلکہ خود اسلام کے خلاف افترا پردازی کا موقع فراہم ہوگیا۔

گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ معاویہ کے دور میں امام حسینؑ کا شہید ہو جانا نہ صرف بے اثر اور غیر مفید ہوتا بلکہ اس طرح دین، امت اور حق کی تمنا امید پر پانی پھر جاتا یوں یہ ایک کھلی خیانت ہوتی جیساکہ بعد میں آپؑ کی شہادت سے دین، حق اور امت کی حفاظت اور پاسداری ہوئی۔ اس وقت حکمران کی بے دینی، دین سے دشمنی اور اس کا انحراف کسی سے پوشیدہ نہ رہا تھا۔ نیز مکارانہ اور عیارانہ سیاسی چالیں ان کے کرتوتوں پر پردہ نہ ڈال سکیں۔ ان حالات میں سکوت اور خاموشی اختیار کرنا دین، امت اور حق کے ساتھ خیانت کے مترادف تھا۔

۱۔ ہماری کتاب "دراسات و بحوث فی التاریخ و الاسلام" کی پہلی جلد میں حضرت ابوذر کے بارے میں مقالے کی طرف رجوع کریں۔

ورنہ امام حسینؑ نے اپنے بھائی امام حسنؑ کی شہادت کے بعد دس سال معاویہ کے دورِ حکومت میں گزارے اور اس کے خلاف قیام نہیں کیا۔ امام حسینؑ نے معاویہ کے زمانے میں سکوت اختیار کیا لیکن آپ ہی نے یزید کے خلاف قیام کیا جبکہ وہی ظلم و ستم اور جبر و تشدد جو یزید کے دور میں تھا معاویہ کے زمانے میں بھی تھا جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہی اس زمانے میں امامؑ کے سکوت اور یزید کے دور میں قیام کا راز ہے۔

یہ تھا وہ مطلب جس کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے تھے، اگرچہ اس بحث کا مقام کہیں اور ہے۔

۲۔ ملاحظہ کریں جب امام حسینؑ نے حلف الفضول کی دعوت دی تو ابن زبیر جیسے دشمنوں نے بھی آپؑ کی آواز پر لبیک کہا جبکہ اس کا اپنی خلافت کے ایام میں ہاشمیوں کے ساتھ برا سلوک کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ابن زبیر انہیں مکہ میں زندہ جلا دینا چاہتا تھا مگر عراق سے ان کی امداد کے لئے ایک گروہ پہنچ گیا جس سے وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اسی طرح ابن عباس کے بقول جب امام حسینؑ عراق کی طرف عازم ہوئے تو ابن زبیر بہت زیادہ خوش ہوا۔ اس نے اپنے خطبوں میں حضور اکرمؐ پر درود بھیجنا ترک کر دیا جب اس کی سرزنش کی گئی تو اس نے ڈھٹائی سے کہا ہاشم کی اولاد جب پیغمبر اکرمؐ پر صلوات سنتی ہے تو اپنے سر کو بلند کر لیتی ہے اس کے نزدیک بدترین چیز ہاشمی خاندان کی خوشی تھی۔ ایک اور روایت کے بقول اس نے کہا کہ رسول اکرمؐ کا خاندان بُرا ہے۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ ان افراد نے امام حسینؑ کی طرف سے حلف الفضول کی دعوت کو تو قبول

۱۔ العقد الفرید ج ۴ ص ۴۱۳ طبع دار الکتاب العربی، شرح نہج البلاغہ للمعتزلی ج ۲۰ ص ۱۲۷، انساب الاشراف ج ۴ ص ۲۸، قاموس الرجال ج ۵ ص ۴۵۲ اور مقاتل الطالبیین ص ۴۷۴ کی طرف رجوع کریں۔

کر لیا لیکن انہی لوگوں نے حسنین علیہما السلام کی امامت کو صلح اور جنگ دونوں صورتوں میں حسنینؑ کی امامت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں حکم خدا اور حکم رسولؐ کی مخالفت کی اور اس امام کی حمایت سے دریغ کیا جس نے اپنے نانا کی امت کی اصلاح کی خاطر قیام کیا تھا بلکہ وہ اس کے برعکس عموماً ان کے اور ان کے خاندان کے ساتھ دشمنی کا اظہار کرتے تھے جیساکہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

پس حلف الفضول پر لبیک کہنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ جبکہ اس کے برعکس روز عاشورا امام حسینؑ کی حمایت نہ کرنے اور کربلا میں ظلم و ستم اور دین و حق سے انحراف کے خلاف کربلا میں آپ کے ساتھ جنگ کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ جبکہ پہلا واقعہ اگرچہ ظلم و استبداد سے جنگ کا نمونہ تھا لیکن درحقیقت اس کا تعلق خاص اشخاص اور محدود زمان و مکان کے ساتھ تھا جبکہ واقعہ کربلا میں قیام کا مقصد سب کے سامنے واضح تھا اور امامؑ نے کئی بار اس کی وضاحت فرمائی تھی۔ اور اس بات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ آپ کے قیام کا مقصد اسلام کے جامع اہداف تھے اور اس میں ذرہ برابر بھی ذاتی مفادات کا عمل دخل نہیں تھا۔

پھر انہوں نے کیوں سکوت اختیار کیا؟ بلکہ ان میں سے بعض نے تو امام حسینؑ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر مسرت کا اظہار کیا جبکہ وہاں پر وہ ان کی مدد کرتے اور اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے آمادہ و تیار نظر آتے ہیں یا کم از کم ان کے ساتھ دینے کے لئے آمادگی کا اظہار کرتے ہیں؟ پھر اگر ان دو قیاموں کا ہدف مشترکہ نہیں بھی تھا تو واقعہ کربلا کا ہدف ان کے دین اور شخصیت کے ساتھ زیادہ وابستگی رکھتا تھا (میل کھاتا تھا) اور زیادہ اہم تھا کیا ابتداء میں ان کا مقصد قوی دشمن کو کمزور کرنا تھا؟ یا یہ کہ وہ شرابی یزید سے ڈرتے تھے جبکہ معاویہ کی طرف سے آسودہ خاطر تھے؟ اور شاید ایسا ہی ہو، ایک اور احتمال بھی دیا جا سکتا ہے کہ حلف الفضول چونکہ جاہلیت کے دور کی یاد تازہ کرتا تھا اور وہ لوگ حق و باطل میں اسلام کی نسبت جاہلیت سے زیادہ نزدیک تھے۔ وہ واقعہ پوری امت کی

تقدیر بدلنے کا موجب ہو اور دین سے مربوط ہی کیوں نہ ہو۔

اور اگر انھیں معلوم ہوجاتا کہ اسلام نے حلف الفضول کی تائید کی ہے اور یہ اسلامی قوانین میں شمار ہوتا ہے تو شاید اس سلسلے میں وہ کوئی اور موقف اختیار کرتے۔ اور یہ بات واقعاً بہت ہی عجیب و غریب ہے۔

۲۔ امام حسینؑ کا یہ موقف اور نبی اکرمؐ کا اس عہد و پیمان کی تائید کرنا جو گزشتہ کلمات میں گزر چکا ہے، اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام نے اس حلف کو منظور کیا ہے کیونکہ مذکورہ پیمان حق و عدالت اور خیر کی بنیاد پر استوار ہے اور کیا اسلام اس کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟ اسلام نے اس پیمان کو قبول کیا جبکہ اس میں شرکت کرنے والے کافر اور مشرک تھے لیکن وہ مسجد "ضرار" کو منہدم کر دیتا ہے جبکہ اس کے بانی ظاہری طور پر اسلام کا اظہار بھی کرتے تھے اور دکھاوے کی خاطر اس پر عمل پیرا بھی تھے۔

یہ بات اسلام کی حقیقت پسندی کو واضح کرتی ہے، اور اس بات کو روشن کرتی ہے کہ یہ دین شکاری کے عمل کو دیکھتا ہے نہ کہ اس کے آنسوؤں کو۔ اسلام ظاہری باتوں سے دھوکا نہیں کھاتا اور ان نعروں سے کبھی بھی فریب نہیں کھاتا جن کے پس پردہ سازش، غداری اور خیانت کار فرما ہو خواہ وہ نعرے کتنے بھی دلکش کیوں نہ ہوں پس حق حق ہے اور وہی قابل قبول ہے۔ اور ہم حق کے مطابق عمل کرنے اور اسے قبول کرنے پر مجبور ہیں چاہے وہ مشرک سے ہی کیوں نہ صادر ہو، اسی طرح باطل باطل ہے اور قابل انکار ہے، اس پر عمل کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اگرچہ وہ خوبصورت اور پرکشش نعروں اور باتوں کے قالب میں ہی کیوں نہ ہو۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسی لئے حضرت امیر المومنینؑ قرآن کو نیزوں پر بلند کرنے کی چال اور سازش کی مذمت کرتے ہیں اور اس سے خبردار کرتے ہیں۔ اس مسئلے میں امامؑ کا راستہ صحیح راستہ تھا اور دوسرے لوگ جو تقویٰ اور عبادت کا تظاہر کرتے تھے انہوں نے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں امیر المومنین علیؑ کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عنایت فرمائے، بتحقیق وہ توانا سرپرست ہے۔

۴۔ نبی اکرمؐ اور آئمہؑ کا پیمان فضول کو اہمیت دینا اسلام کی وسعت نظری پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام اپنے خول کے اندر بند نہیں رہتا۔ اسلام ہر اس چیز کی حمایت کرتا اور اسے اپنا لیتا ہے جو انسان کے لئے خیر و برکت کا موجب ہو، انسانیت کے رشد و تکامل میں سہیم ہو، احساس ذمہ داری کو اجاگر کرتی ہو۔ اس کے اعلیٰ اہداف کی تکمیل کرتی ہو، فطری تقاضوں کے مطابق ہو اور عقل سلیم کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

۵۔ البتہ ان لوگوں کے زبیر بن عبدالمطلب کی حلف الفضول کی دعوت کو قبول کرنے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً

الف: انسانی فطرت کا تقاضا کیونکہ اس پیمان کا پیغام فطرت اور عقل سلیم کے تقاضوں کے عین مطابق تھا اس کے ساتھ ہی وہ انسانی اور اخلاقی شعور سے ہم آہنگ تھا۔

ب: مصلحت اندیشی کیونکہ مکہ میں امن و امان نہ ہونے کی وجہ سے تجارتی وفود کی آمد اور اہل مکہ کے ساتھ ان کے معاملات میں تیزی سے کمی آنے کا خطرہ تھا۔

ج: اسی طرح دیگر وجوہات ہو سکتی تھیں مثلاً عربوں کے دلوں میں مکہ اور اہل مکہ کے لئے موجود جذبہ احترام اور تقدس کی حفاظت وغیرہ وغیرہ۔ پہلی فصل میں بیان ہونے والے مطالب یہاں پر بھی مفید ہیں۔

حضورؐ کا بکریاں چرانا

مورخین کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ قبیلہ بنی سعد کے ہاں رہتے ہوئے بکریاں چرایا کرتے تھے اور اپنے گھر والوں کے لئے گلہ بانی کرتے تھے بلکہ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپؐ اہل مکہ کی بکریاں بھی چراتے تھے۔ یہاں تک کہ دوسروں کے علاوہ بخاری نے تو کتاب "اجارہ" میں یہاں تک ذکر کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث

نہیں فرمایا مگر یہ کہ اس نے گلہ بانی کی ہو۔ صحابہ نے پوچھا اور آپ؟ نے ارشاد فرمایا: ہاں میں نے بھی قراریط کے بدلے مکہ والوں کی بکریاں چرائی ہیں۔ (۱) اور قراریط سے مراد درہم اور دینار کی کچھ مقدار بتائی گئی ہے جس سے معمولی اشیاء خریدی جا سکتی ہوں۔ (۲)

لیکن اس بات میں بہت زیادہ شک و شبہ پایا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ اتنی مزدوری پر غیروں کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ مزدوری کی مقدار اتنی معمولی ہے کہ بوڑھی عورتیں بھی اسے قبول نہیں کرتیں۔ اسی طرح آپؐ بکریاں چرانے میں جو وقت لگاتے اور محنت کرتے تھے اس کے مقابلے میں یہ معمولی رقم قطعاً نامناسب ہے۔ اس بات میں ہمارے شک و تردد کی دو وجوہات ہیں۔

اول: معتبر مورخ یعقوبی نے صریحاً کہا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم ہرگز کسی کے اجیر نہیں بنے۔ (۳)

دوم: روایات کا تضاد، بعض روایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میں اپنے خاندان والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا"۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں مکہ والوں کے لئے گلہ بانی کرتا تھا"۔ بعض روایات نے آپؐ کا قول "قراریط" (۴) کے ساتھ نقل کیا ہے جبکہ بعض دوسری روایات میں "اجیاد" (۵) کا ذکر آیا ہے۔ جب راوی ایک ہو تو یہ اختلاف قابل قبول نہیں ہے۔

۱۔ بخاری حاشیہ فتح الباری ج ۴ ص ۳۶۳، دحلان کی السیرۃ النبویۃ ج ۱ ص ۵۱ اور السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۵۔

۲۔ زینی دحلان کی السیرۃ النبویۃ ج ۱ ص ۵۱، السیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۵ اور فتح الباری ج ۴ ص ۳۶۴۔

۳۔ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص ۲۱ طبع صادر۔

۴۔ معمولی اجرت۔ ۵۔ ایک جگہ کا نام۔

ہاں بعض افراد نے ذکر کیا ہے کہ عرب قراریط کو نہیں جانتے تھے بلکہ یہ تو مکہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ (۱)

بنابرایں "قراریط" والی روایت اور "اجیاد" والی روایت میں اختلاف کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ یہ دو نام ایک ہی جگہ کے ہوں یا ایک دوسرے کے نزدیک دو جگہوں کے نام ہوں لیکن یہ تاویل بہت کمزور ہے کیونکہ بخاری کی روایت میں "علی قراریط" ذکر ہوا ہے۔ اور لفظ "علی" سے اجر و مزدوری ظاہر ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس اعتراض کا جواب یوں دیا جائے کہ شاید قراریط مکہ میں ایک پہاڑ ہو جس پر رسول خدا بکریاں چرایا کرتے ہوں۔ اس اور ان کے علاوہ دیگر تمام احتمالات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صرف اس صورت میں قابل قبول ہو سکتے ہیں جب ان پر معصومؑ سے کوئی روایت نقل ہوئی ہو اور یہاں ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے ہاں ابوہریرہ اور دوسرے راویوں نے حدیثیں بیان کی ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

نکتہ:

یہاں پر بعض لوگوں نے فلسفہ بگھارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھیڑیں

۱۔ فتح الباری ج ۴ ص ۳۶۳ میں ابن ناصر اور سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۶ کی پیروی کرتے ہوئے ابراہیم حربی اور صوبہ ابن جوزی سے نقل کرتے ہوئے اور جو کچھ الصحیح میں آیا ہے اس سے عربوں کی قراریط سے عدم آگاہی کی تائید ہوتی ہے اور اس میں قراریط نامی سرزمین کا ذکر آیا ہے۔ فتح الباری ج ۴ ص ۳۶۴ اور بعض افراد کا یہ قول درست نہیں ہے کہ مکہ میں اس نام کی کوئی جگہ معروف نہیں کیونکہ ہمارے دور میں اس کا معروف نہ ہونا اس زمانے میں اس کے معروف نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

چرانا نہایت ہی دشوار کام ہے کیونکہ بھیڑیں سرکش ترین جانور ہیں اور ان کے ساتھ رہنا دل کے اندر جذبہ مہربانی و عطوفت کی بیداری کا موجب بنتا ہے پس جس وقت آپؐ کو بشر کی قیادت اور رہبری کا فریضہ سونپا گیا تو اس سے پہلے آپؐ کا مزاج نرم ہوچکا تھا طبیعت کی فطری سختی اور زیادتی کا خاتمہ ہوگیا تھا اور آپؐ ایک معتدل ترین شخصیت بن چکے تھے۔ (۱)

لیکن کیا اس بات کو کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کو مزاج کی فطری درشتی اور جذبہ ظلم سے تہذیب کی ضرورت تھی۔ کیا ان کی طبیعت میں غضب اور جبلی ظلم موجود تھا جس میں اعتدال اور تہذیب کی ضرورت تھی؟ اور اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا (تربیت کے لئے) اس سے بہتر کوئی اور مدرسہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات شق صدر (جسے ہم نے جھوٹ ثابت کیا) کے منافی نہیں ہے جس کے یہ لوگ قائل ہیں کیا ظلم اور سختی شیطان کا حصہ نہ تھا جسے جبرئیلؑ نے عمل جراحی کے ذریعے سے جڑ سے اکھاڑ دیا تھا؟ کیا روایات کے مطابق بچپن سے ہی آپؐ کے ہمراہ ایک فرشتہ مقرر نہیں تھا جو آپؐ کی راہنمائی اور اصلاح کرتا تھا؟

کیا اللہ تعالی کے پاس اپنے نبیؐ کی تہذیب اور آپ کی سخت مزاجی کو ختم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا؟ اور کیا یہ بات صحیح ہے کہ بھیڑوں کو چرانا باقی تمام جانوروں سے مشکل ترین کام ہے؟ اور کیا ظلم انسان کے اندر جبلی طور پر موجود ہے جسے بھیڑیں چرا کر ہی ختم کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جو پانی کے اندر سختی اور جبلی ظلم نہیں کرتا یا یہ کہ ظلم و سختی اس کے اندر دوسروں کی نسبت کم ہوتی ہے؟

پھر کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بھیڑ بکریاں چرانا ایک عام کام تھا جسے آنحضرتؐ نے معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح جن کے لئے بھیڑ بکریاں چرانا زندگی گزارنے اور رزق

۱۔ سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۶، سیرۃ نبویۃ لدحلان ج ۱ ص ۵۱ اور فتح الباری ج ۴ ص ۳۶۴ کی طرف رجوع کریں۔

کمانے کا ایک عام وسیلہ تھا، انجام دیتے تھے۔ اسی طرح کے اور دوسرے سوالات ہیں جن کا ان کے پاس کوئی مفید اور قانع کنندہ جواب نہیں ہے۔

البتہ جیساکہ بعض افراد نے کہا ہے اس کی یہ علت بیان کی جا سکتی ہے کہ چوپانی لوگوں سے دوری اور معاشرتی پریشانیوں اور شور شرابے سے ہٹ کر غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور رسول اکرمؐ کا غار حرا میں جانا بھی تفکر کے لئے، لوگوں سے کنارہ کشی، خداوند کی مخلوق میں غور و خوض، عبادت اور تزکیہ نفس کی خاطر ہوتا تھا۔

بعض دوسرے افراد کا یہ نظریہ ہے کہ حیوان چرانا متفرق و پراکندہ حیوانوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھالنے کا موجب ہے اور یہ بات نبوت کی ذمہ داریوں سے مناسبت رکھتی ہے جنہیں بہت جلد پیغمبر اکرمؐ کے کاندھوں پر آنا تھا اور جس کے لئے آپؐ کو ریاضت نفس اور دوسروں کی خیر خواہی کے جذبے میں اضافے کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالٰی، پیغمبر اکرمؐ کے اندر تحمل و برداشت پیدا کرنے اور آپ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا اہتمام فرما رہا تھا۔ تاکہ آپؐ نبوت کی عظیم ذمہ داریوں کو نبھا سکیں۔ البتہ یہ سب کچھ عام اور طبیعی طور پر ہوا ہے جیساکہ یہ بات ارسال رسل سے واضح ہے۔ ہاں اللہ معجزات وغیرہ سے بھی انبیاء کی مدد کرتا رہا۔

شام کا دوسرا سفر

کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں شام کی طرف دوسرا سفر اختیار کیا۔ (۱)

۱۔ بحار الانوار ج ۱۶ ص ۹ میں بعض لوگوں سے نقل ہوا ہے کہ آپ (ص) کا یہ سفر تہامہ میں بازار حباشہ کی طرف تھا۔ اسی طرح کشف الغمہ ج ۲ ص ۱۳۵ میں جنابذی کے معالم العترۃ سے یہی نقل ہوا ہے (مکہ کے اوپر بالائی اور حجاز کے جنوبی حصول کو تہامہ کہتے ہیں)۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت خدیجہؑ کے لئے ایک تجارتی سفر تھا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابو طالبؑ کے معاشی حالات بہت خراب ہوگئے اور سب جمع شدہ پونجی خرچ ہوگئی تھی تو انہوں نے آپؐ کو اس سفر کی تجویز پیش کی لیکن آپؐ نے یہ قبول نہ فرمایا کہ خود جا کر حضرت خدیجہ سے بات کریں۔ جب حضرت ابو طالبؑ اور حضرت رسول اکرمؐ کے درمیان ہونے والی گفتگو کی خبر حضرت خدیجہ (س) تک پہنچی تو انہوں نے آنحضرتؐ کو خود تجارت کی پیشکش کی اور دوسروں کی نسبت دوگنا معاوضہ ادا کیا کیونکہ وہ آپؐ کی سچائی، زبردست امانتداری اور اعلیٰ اخلاق سے واقف تھیں۔

بعض نے یوں بھی روایت کی ہے کہ حضرت ابو طالب نے خود حضرت خدیجہ سے بات چیت کی اور انہوں نے بھی کمال شوق اور رغبت سے اپنی رضا مندی کا اظہار کیا اور جو معاوضہ و اجرت طلب فرمایا انہوں نے ادا کر دی۔

پس آنحضرتؐ نے شام کا سفر اختیار کیا اس تجارتی سفر میں آپ کو دوسروں کی نسبت کئی گنا زیادہ منافع ہوا اور بہت سی واضح اور روشن کرامات آپؐ سے ظاہر ہوئیں۔ جب قافلہ مکہ واپس پہنچا تو میسرہ نے تمام واقعات سے حضرت خدیجہ کو آگاہ کیا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ نے خود اپنے مشاہدات اور میسرہ کی باتوں کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے نقل کیا۔ جیساکہ کہا جاتا ہے لیکن ہمیں اس میں شک و تردد ہے۔ (۱) اس نے حضرت خدیجہ سے کہا کہ جو کچھ بتایا گیا ہے اگر صحیح ہو تو آپؐ اس امت کے نبی ہیں۔ (۲)

اس کے بعد جیساکہ کہا جاتا ہے حضرت خدیجہ نے آپؐ کی زوجیت میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

۱۔ ورقہ بن نوفل کے بارے میں اقوال اور آغاز وحی میں اس کے کردار پر ہم انشاء اللہ بہت جلد گفتگو کریں گے۔

۲۔ البدایة و النهایة ج ۲ ص ۲۹۶ اور سیرة الحلبیة ج ۱ ص ۱۳۶۔

لیکن جو کچھ کہا گیا ہے خصوصاً یہ کہ حضرت خدیجہ نے آنحضرتؐ کو تجارت کے لئے اجیر کیا، ہمیں اس میں شک و شبہ ہے کیونکہ ابن واضح المعروف بالیعقوبی جیسا معتبر اور موثق مورخ کہتا ہے: "لوگ کہتے ہیں کہ خدیجہ نے آپؐ کو اجیر کیا ایسا ہرگز نہیں ہے، آپؐ کبھی کسی کے اجیر نہیں ہوئے"۔ (۱)

شاید رسول اکرمؐ اور ان کے آباء و اجداد کی عزت نفس، پروردگار عالم کی طرف سے آنحضرتؐ کی حفاظت و نگرانی کا بندوبست اور اسی طرح ابوطالبؑ کی عزت و شرافت کے تناظر میں جو کچھ حضرت ابوطالبؑ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ سب ان سے بعید ہے۔

بنابرایں آنحضرتؐ کا سفر شام حضرت خدیجہ کے کارندے کے طور پر نہ تھا بلکہ آپؐ نے نفع میں شرکت کے عنوان سے یا بطور شریک ان کا مال تجارت لے کر شام کا سفر اختیار کیا۔

علامہ مجلسی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوطالبؑ نے آنحضرتؐ سے حضرت خدیجہ کے مال سے تجارت کرنے والوں کا ذکر کیا اور آپؐ کی تشویق فرمائی ہے تاکہ آپؐ بھی اس کام میں پہل کریں لہذا آپؐ نے ایسا ہی کرتے ہوئے شام کا تجارتی سفر اختیار کیا۔ (۲) یہ روایت اسی حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ آنحضرتؐ نے نفع میں شرکت کی شرط پر

۱۔ تاریخ یعقوبی ج۲ ص ۲۱ اس نے سفر السعادۃ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) بعثت کے بعد اور ہجرت سے پہلے بیچنے سے زیادہ خریدتے تھے۔ ہجرت کے بعد صرف تین بار فروخت کا معاملہ کیا البتہ آپ (ص) کی خرید بہت زیادہ تھی لیکن دوسروں کے ساتھ ان کی شراکت کے بارے میں اختلاف ہے اور ہمارے پاس اس کی تحقیق کی فرصت نہیں ہے۔

۲۔ بحار الانوار ج۱۶ ص ۲۲ البکری سے نقل ہوا ہے اور ص ۳ پر الخرائج اور ص ۱۸۶ اور ۱۸۷ پر الجرائح سے نقل کیا گیا ہے۔

تجارت فرمائی۔ اسی طرح "جنابذی" کی روایت بھی صراحت کے ساتھ مقاربت پر دلالت کرتی (۱) ہے۔

رسول اکرمؐ کی حضرت خدیجہ سے شادی

حضرت خدیجہ کا شمار شرافت اور عزت کے لحاظ سے قریش کی بہترین عورتوں میں ہوتا تھا وہ مالدار ترین اور خوبصورت ترین خاتون گنی جاتی تھیں۔ دور جاہلیت میں انھیں طاہرہ کا لقب دیا گیا تھا اور انھیں "سیدہ قریش" کہا جاتا تھا۔ ان کے رشتہ دار ان سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔

قریش کے سرداروں نے انھیں شادی کے پیغام بھجوائے اور بہت زیادہ مال کی پیشکش کی۔ ان میں سے عقبہ بن ابی معیط، صلت بن ابی یہاب، ابو جہل اور ابو سفیان قابل ذکر ہیں۔ (۲) لیکن حضرت خدیجہ نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور نبی اکرمؐ کے نیک اخلاق شرافت نفس، صفات عالیہ اور عادات کریمہ کی وجہ سے آپ کا انتخاب کیا۔ ہم روایات کی کثرت کے پیش نظر قطعی طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہ نے پہلے آپؐ سے ازدواج کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

پس حضرت ابوطالبؑ رشتے کے لئے ان کے گھر والوں کے پاس گئے اور قریش کے چند افراد ان کے سرپرست اور چچا عمرو بن اسد کے پاس گئے کیونکہ حضرت خدیجہ کے والد فجار کی لڑائی میں یا اس سے بھی پہلے قتل ہوگئے تھے۔ (۳)

۱۔ بحار الانوار ج ۱۶ ص ۹، کشف الغمۃ ج ۲ ص ۱۳۳ میں معالم العترۃ جنابذی سے نقل کیا گیا ہے۔

۲۔ بحار الانوار ج ۱۶ ص ۲۲

۳۔ کشف الغمۃ ج ۲ ص ۱۳۹، بحار الانوار ج ۱۶ ص ۱۲ اور کشف الغمۃ ص

اور یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ حضرت ابوطالب رشتہ مانگنے کے لئے ورقہ بن نوفل اور حضرت خدیجہ کے چچا کے پاس گئے یا صرف ورقہ کے پاس گئے (۱) کیونکہ اس بات پر اجماع کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ صرف عمرو بن اسد کے پاس جانا وقوع پذیر ہوا ہے۔ (۲)

لیکن خود ورقہ کے بارے میں ہم نہیں جانتے کیا کہیں؟ بقولے ہر جگہ پر ثعلبہ کا اثر نظر آتا ہے۔ (۳) رسول اکرمؐ سے مربوط کوئی بھی چھوٹا واقعہ ہو یا بڑا یہ وہاں بڑھ چڑھ کر حاضر ناظر ہوتا ہے اور یہی بات میرے لئے شک و شبہ کا باعث ہے کہ آیا وہ ایک افسانوی شخصیت ہے یا حقیقی۔

ملاحظہ کیجئے ایک ہی کردار جو ایک مرتبہ حضرت خدیجہ کے باپ سے منسوب کیا جاتا

---

۱۹ پر واقدی سے نقل کیا گیا ہے۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۸ میں آیا ہے کہ جو کچھ اہل علم کے نزدیک ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جنگ فجار سے پہلے حضرت خدیجہ کے والد دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ اسی طرح تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۳۶ پر بھی ذکر ہوا ہے۔

۱۔ بحار ج ۱۶ ص ۱۹ از واقدی، سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۹، الکافی ج ۵ ص ۳۷۴ اور ۳۷۵ اس میں مذکور ہے کہ ورقہ حضرت خدیجہ کے چچا تھے۔ بحار ج ۱۶ ص ۱۴ اور ۲۱ میں کافی اور بکری سے یہی بات منقول ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ ورقہ، نوفل بن اسد کے بیٹے ہیں جبکہ حضرت خدیجہ خویلد بن اسد کی بیٹی ہیں۔

۲۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۷

۳۔ کہتے ہیں کہ "بنی ثعلبہ" کے ایک شخص سے اس کی قوم نے برا سلوک کیا وہ کسی دوسری جگہ گیا وہاں پر بھی اس سے برا سلوک کیا گیا تب سے یہ ضرب المثل مشہور ہوگئی کہ ہر جگہ ثعلبہ کا اثر ہے۔

ہے، دوسری مرتبہ ان کے چچا سے اور تیسری مرتبہ اسی کو ورقہ بن نوفل سے نسبت دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ الفاظ اور جملات بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں چہ جائیکہ افعال اور واقعات۔ آپ ان روایات کی طرف رجوع کریں اور موازنہ کریں۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حضرت خدیجہ کا رشتہ مانگنے کیلئے حضرت ابو طالب گئے تھے نہ کہ حضرت حمزہ جیساکہ ابن ہشام نے اپنی کتاب سیرہ میں اس پر اکتفا کیا ہے۔ (۱) کیونکہ حضرت حمزہ کا جانا حضرت ابوطالب کو قریش کے پاس حاصل قدر و منزلت کے پیش نظر مناسب لگتا ہے خصوصاً اس وقت جب یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت حمزہ رسول اللہؐ سے صرف دو یا چار سال بڑے تھے اس کے علاوہ یہ بات تمام مورخین کے نظریے کے خلاف بھی ہے۔

بعض افراد نے اس کی یوں تاویل کرنے کی کوشش کی ہے کہ ممکن ہے حضرت حمزہ حضرت ابوطالب کے ساتھ گئے ہوں لیکن اسے صرف حضرت حمزہ سے منسوب کیا گیا ہو۔ (۲) لیکن یہ تاویل بے بنیاد ہے کیونکہ یہاں پر ایک اور سوال اٹھتا ہے کہ آخر یہ نسبت حمزہ کے علاوہ قریش میں سے دوسرے بنی ہاشم یا غیر بنی ہاشم کے افراد جو حضرت ابوطالب کے ساتھ گئے تھے کی طرف کیوں نہ دی گئی؟

حضرت ابوطالب اور خواستگاری

بہرحال حضرت ابوطالب نے بعثت سے پندرہ سال قبل رسول اکرمؐ کے لئے حضرت خدیجہ کا رشتہ مانگا جیساکہ مشہور ہے اور مورخین کے بقول انہوں نے خواستگاری کے دوران یوں کہا: "الحمد لربّ هذا البيت، الذي جعلنا من زرع ابراهيم، و ذرية اسماعيل، و

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۱، سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۸ اسی طرح محب الطبری سے بھی نقل ہوا ہے۔

۲۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۹

خدیجہ (س) - ایک اعلیٰ نمونہ

یہاں ہمیں حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی طرف سے نبی اکرمؐ کو ازدواج کی تجویز کے بارے میں کہنا چاہیے کہ ایک آزاد، سمجھدار اور عقلمند خاتون ایسا ہی کرتی ہے وہ دنیاوی زرق برق کی وجہ سے مغرور نہیں ہوتی، وہ لذت برائے لذت یا مال و شہرت کے پیچھے نہیں جاتی بلکہ اسے ایسی چیزوں کی تلاش ہوتی ہے جن کے ذریعے سے زندگی کے اعلیٰ مقاصد حاصل ہو سکیں اور وہ ان پر عمل کرے جیساکہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے کیا۔

خدیجہ نے زعماء قریش جو مالدار، قدرت مند، صاحب اقتدار، طاقتور اور صاحبان جاہ و مقام تھے کو یکسر ٹھکرا دیا۔ اسے ایک مرد فقیر کی تلاش تھی جس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اس نے اپنی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کو شادی کا پیغام بھیجا کیونکہ اس کی نظر میں مذکورہ چیزوں کی کوئی اہمیت نہ تھی کیونکہ کبھی کبھار یہی چیزیں انسان اور اس کی زندگی کی بربادی کا موجب بن جاتی ہیں بلکہ پوری انسانیت کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ خدیجہؑ کے مدنظر صرف اور صرف اخلاق فاضلہ، عادات پسندیدہ، عملی حقیقت پسندی اور ہدف کی بلندی تھی۔

کیونکہ ان امور کے ذریعے سے مال و دولت، قدرت و طاقت اور جاہ و عظمت کو تسخیر کیا جا سکتا ہے اور ہر چیز کو انسان اور انسانیت اور اس کے مراتب عالیہ میں کمال کے لئے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

قریشی عورتوں میں خدیجہ (س) کا مقام

یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہے کہ تمام مورخین اپنے انداز بیان کے ذوق اور طریقہ کار کے اختلاف کے باوجود حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ قریش کی وجیہہ ترین خاتون تھیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آنحضرتؐ کی تمام ازواج مطہرات میں سے حضرت خدیجہ افضل ہیں۔

شاید پیغمبر اکرمؐ کی بعض ازواج کے حضرت خدیجہ (س) سے ان کی وفات کے بعد بھی حسد کا سبب یہی ہو اسی لئے وہ ہمیشہ ان کی عیب جوئی کرتی اور نقص نکالتی رہتی تھیں جبکہ وہ ان کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کے گھر میں ہرگز اکٹھی نہیں رہی تھیں۔ اور شاید نبی اکرمؐ کی ازواج میں فضیلت و برتری محبت و اخلاص بلکہ خوبصورتی کے لحاظ سے بھی ام سلمہ سلام اللہ علیہا کو دوسرا مقام حاصل تھا۔ جیساکہ امام محمد باقرؑ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔

بہرحال حضورؐ کی صاحب جمال و صاحب اخلاص بیویاں ہمیشہ ان بیویوں کی طرف سے مہلک قسم کے حسد اور سازشوں کا شکار رہتی تھیں جن کا حسن و جمال سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ یہ بیویاں رسول خداؐ کے سامنے مکمل ادب و احترام کا خیال بھی نہیں رکھتی تھیں بلکہ وہ اپنے اعمال اور کرتوتوں کی وجہ سے آنحضرتؐ کو تکلیف پہنچاتی تھیں۔ البتہ اس مطلب کی مزید وضاحت آگے آئے گی۔

کیا حضرت خدیجہ (س) کنواری تھیں؟

بعض افراد کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ کے علاوہ کسی کنواری لڑکی سے شادی نہیں کی۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی اکرمؐ کے ساتھ ازدواج سے پہلے دو اور مردوں، عتیق بن عابد مخزومی اور ابوہالہ تمیمی سے یکے بعد دیگرے شادیاں کیں اور ان دونوں سے آپ صاحب اولاد بھی تھیں۔

لیکن ہم اس دعویٰ کو شک و تردد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ قوی احتمال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بہت ساری باتیں سیاسی مقاصد کے لئے گھڑی گئی ہیں۔ یہاں پر ہم اس اختلافی بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ ابوہالہ کون تھا۔ کیا وہ نباش بن زرارہ تھا یا زرارہ بن نباش؟ یا هند بن مالک اور کیا وہ صحابی تھا یا نہیں؟

اسی طرح ہم اس بات کے بھی متعرض نہیں ہوتے کہ خدیجہ کے بطن سے هند نام کی جو اولاد متولد ہوئی وہ پہلے خاوند کی تھی یا دوسرے کی؟ اگر عتیق کا تھا تو بیٹا تھا ورنہ بیٹی

اور یہ کہ کیا وہ جنگ جمل میں حضرت علیؑ کے لشکر کے ساتھ مارا گیا یا بصرہ میں طاعون کی بیماری سے وفات پا گیا۔ (۱) ہم ان بحثوں کو طول دینا نہیں چاہتے بلکہ یہاں پر ہم مندرجہ ذیل امور کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اول: ابن شہر آشوب کہتے ہیں کہ احمد بلاذری اور ابو القاسم کوفی نے اپنی اپنی کتابوں میں، مرتضی نے اپنی کتاب شافی میں اور ابو جعفر نے تلخیص میں نقل کیا ہے کہ "رسول اللہؐ نے جب حضرت خدیجہ (س) سے شادی کی تو وہ باکرہ تھیں"۔

اس کی مزید تائید "الانوار و البدع" نامی کتابوں میں مذکور اس بات سے ہو جاتی ہے کہ "رقیہ اور زینب حضرت خدیجہ (س) کی بہن ہالہ کی بیٹیاں تھیں"۔ (۲)

دوم: ابو القاسم کوفی کہتے ہیں کہ "اس امر پر اہل قلم اور احادیث کے ناقلین میں سے ہر خاص و عام کا اتفاق ہے کہ قریش کے سرداروں، رؤسا اور نوجوانوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے حضرت خدیجہ (س) کو شادی کا پیغام نہ بھیجا ہو مگر حضرت خدیجہ (س) نے سب کو منفی جواب دے دیا۔ جب رسول اکرمؐ نے ان سے شادی کی تو قریش کی خواتین ان سے ناراض ہو گئیں اور ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خواتین ان سے کہتی تھیں کہ "قریش کے امراء اور رؤسا نے تم سے شادی کی خواہش کی تم نے ان سب کو

۱۔ ان اختلافات سے مزید آگاہی کے لئے مندرجہ ذیل مصادر کی طرف رجوع کیا جائے اور ان کا آپس میں موازنہ کیا جائے۔

الاصابة ج ۳ ص ۶۱۱ اور ۶۱۲، مصعب زبیری کی کتاب نسب قریش ص ۲۲، سیرة حلبیة ج ۱ ص ۱۴۰ قاموس الرجال ج ۱۰ ص ۴۳۱ اور اسد الغابة ج ۵ ص ۱۲، ۱۳ اور ۷۱ وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ مناقب آل ابی طالب ج ۱ ص ۱۵۹، بحار الانوار، رجال المامقانی اور قاموس الرجال یہ سب مناقب سے نقل کرتے ہیں۔

ٹھکرا دیا اور تنگدست، فقیر اور ابوطالب کے یتیم سے شادی رچا لی"۔ پس ایسی صورت حال میں سمجھدار افراد کی نظر میں یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ حضرت خدیجہ قریش کے سرداروں کے رشتوں کو تو رد کر دے لیکن بنی تمیم کے ایک دیہاتی سے شادی کر لے۔ کیا اہل فکر و نظر اسے واضح طور پر محال اور نہایت بیہودہ بات نہیں سمجھتے؟ (۱)

مذکورہ بالا گفتگو میں اس بات کو کہ ایسی شریف اور حسین و جمیل خاتون اتنی لمبی مدت تک شادی کے بغیر رہی ہو بعید از قیاس قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے "الاستغاثہ" کی دلیل کمزور نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کی شرافت اور حسن اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ قریش کے سرداروں کو ٹھکرا دے اور بنی تمیم کے اعرابی سے رشتہ جوڑ لے۔ اب رہی یہ بات کہ ان کے باپ یا ولی نے انہیں اتنی عمر تک کیوں بٹھائے رکھا؟ جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے تو واضح ہے کہ ان کا باپ فجار کی لڑائی میں قتل ہوگیا تھا اور ولی کے پاس باپ کی ولایت نہیں تھی تاکہ وہ جس سے چاہتا اسے شادی پر مجبور کرتا۔ علاوہ ازیں ایک پاک دامن، عفیف اور حسین خاتون کا باکمال اور صاحب فضیلت مرد کے انتظار میں زیادہ مدت کنواری بیٹھنا زیادہ بعید بھی نہیں ہے خصوصاً اس دور میں جب ایسا انسان نایاب ہو۔

سوم: اس مقام پر ان اقوال کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جن میں نبی اکرمؐ کے علاوہ دوسروں سے حضرت خدیجہ (س) کے صاحب اولاد ہونے کا ذکر ہوا ہے۔

الف۔ بعض لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ جب نبی اکرمؐ نے اعلانیہ طور پر اسلام کی دعوت کا آغاز فرمایا تو اسلام کے سب سے پہلے شہید، حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے بیٹے حارث بن ابی ہالہ تھے۔ (۲)

۱۔ الاستغاثہ ج ۱ ص ۷۰

۲۔ ابو ھلال عسکری کی الاوائل ج ۱ ص ۳۱۱ اور ۳۱۲؛ الاصابۃ ج ۱ ص ۲۹۳ یہاں پر ابو ھلال، ابن کلبی اور ابن حزم سے نقل کیا گیا ہے۔

لیکن اس بات کے دعویدار قتادہ کی صحیح سند کے ساتھ نقل ہونے والی اس روایت کا کیا جواب دیں گے کہ "اسلام کا اولین شہید، حضرت عمار یاسر کی ماں سمیہ ہیں"۔ (۱) یہی بات مجاہد سے بھی نقل کی گئی ہے۔ (۲)

ب۔ روایت کی گئی ہے کہ حضرت خدیجہ (س) کی ایک بہن تھیں جن کا نام "ہالہ" تھا (۳) اس نے قبیلہ مخزوم کے ایک شخص سے شادی کی، اس سے ایک لڑکی بنام ہالہ پیدا ہوئی۔ پھر اس نے ایک تمیمی شخص جسے ابو ھند کہا جاتا تھا سے شادی کی، اس کی صلب سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ھند رکھا گیا۔ اس تمیمی شخص کی دوسری بیوی سے دو بیٹیاں رقیہ اور زینب نام کی تھیں۔ یہ تمیمی شخص اور اس کی دوسری بیوی دنیا سے چل بسے۔ اس کے بعد ہند اپنے باپ کی قوم سے ملحق ہوگیا اور حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ اور اس کی دو سوتیلی بیٹیاں اور اس تمیمی کی دوسری بیوی باقی رہ گئیں۔ اس کے بعد یہ تینوں حضرت خدیجہ کے پاس رہنے لگیں۔ حضرت خدیجہ کی رسول اللہ سے شادی کے بعد ہالہ کا انتقال ہوگیا اور وہ دونوں لڑکیاں رسول اللہ اور حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے دامن میں پرورش پانے لگیں۔

عربوں کا یہ نظریہ تھا کہ "ربیبة" (۴) انسان کی بیٹی ہوتی ہے۔ اس لئے انہوں نے دو لڑکیوں رقیہ اور زینب کو آنحضرتؐ سے منسوب کیا جبکہ وہ حضرت خدیجہ کی بہن کے خاوند ابو ھند کی بیٹیاں تھیں اور یہی بات خود ھند کے بارے میں بھی ہے۔ (۵)

۱۔ الاصابۃ ج ۴ ص ۳۳۵ اور طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۹۳ طبع لیدن

۲۔ الاستیعاب حاشیہ الاصابہ ج ۴ ص ۳۳۱

۳۔ اس کا نام انساب کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے مثال کے طور پر مصعب زبیری کی "نسب قریش" ص ۱۵۷ اور ۱۵۸

۴۔ اس بچے کو کہا جاتا ہے جو ماں باپ کے علاوہ کسی اور کی گود میں پلا بڑھا ہو

۵۔ الاستغاثہ ج۱ ص ۶۹-۶۸ اور مکارم الاخلاق میں چھاپ شدہ رسالہ ص ۶۔

ھند کے باپ کے نام پر جو اختلافات پایا جاتا ہے شاید اسی سے ان روایات کی تائید ہوتی ہو۔ مزید وضاحت کیلئے جن مدارک کا ہم نے وہاں ذکر کیا، انکی طرف رجوع کیا جائے۔

کیا عثمان کی دو بیویاں پیغمبرؐ کی بیٹیاں تھیں؟

جو کچھ ہم نے کتاب الاستغاثہ سے ابھی نقل کیا ہے اس کے علاوہ ہم یہ بھی بیان کرتے چلیں کہ عثمان کی بیویوں کے پیغمبرؐ کی بیٹیاں نہ ہونے پر دلالت کرنے والی باتوں میں سے ایک وہ اقوال ہیں جو مذکورہ قول کے منافی ہیں۔ علاوہ برآں ان میں سے ایک "مقدسی" کا قول ہے جو اس نے سعید بن ابو عروۃ اور اس نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ "اسلام سے قبل حضرت خدیجہ (س) کے بطن سے آنحضرتؐ کا ایک بیٹا عبد مناف پیدا ہوا اور اسلام کے بعد انھوں نے دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کو جنم دیا۔ ایک بیٹے کا نام قاسم تھا، جس کی وجہ سے آپؐ کی کنیت ابو القاسم ہی۔ یہ بچہ جب چلنے کے قابل ہوا تو فوت ہوگیا۔ دوسرے بیٹے کا نام عبداللہ تھا یہ ایام طفولیت میں وفات پا گیا اور بیٹیوں کے نام ام کلثوم، زینب، رقیہ اور فاطمہ تھے۔ (۱) قسطلانی اپنے کلام کے دوران کہتا ہے "کہا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا ایک بیٹا بنام عبد مناف بعثت سے قبل پیدا ہوا اور یوں آپؐ کی اولاد کی تعداد بارہ تک پہنچ جاتی ہے سوائے اس بیٹے کے باقی سارے بعثت کے بعد متولد ہوئے۔ (۲) جیساکہ بعض افراد نہایت صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ رقیہ ان سب سے چھوٹی تھیں یعنی جناب فاطمہ (س) سے بھی چھوٹی تھیں۔ (۳)

۱۔ البدء و التاریخ ج ۵ ص ۱۶ اور ج ۴ ص ۱۳۹

۲۔ المواهب اللدنیة ج ۱ ص ۱۹۶

۳۔ جرجانی کی الاصابة ج ۴ ص ۳۰۴ کی طرف رجوع کیا جائے، الاستیعاب (الاصابة کے حاشیہ کے ساتھ) ج ۴ ص ۲۹۹ اور نسب قریش ص ۲۱

ان باتوں کی روشنی میں یہ قول کیسے درست ہو سکتا ہے اور ہم کیونکر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی ان دو بیٹیوں کی شادی دورِ جاہلیت میں ابو لہب کے دو بیٹوں سے ہوئی جب اسلام آیا تو وہ ان سے جدا ہو گئیں۔

مقدسی کہتا ہے کہ "پس رسول اللہ نے رقیہ کی شادی عثمان بن عفان سے کر دی اور رقیہ نے عثمان کے ساتھ دو بار حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پہلی ہجرت کے دوران کشتی میں ان کا حمل ساقط ہوا۔ (۱)

ہم کیسے اس بات پر یقین کر لیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت بعثت کے پانچویں سال انجام پائی۔ اس صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ رقیہ بعثت سے پہلے ابو لہب کے بیٹے سے شادی کرے پھر اس سے علیحدگی اختیار کر کے عثمان سے نکاح کرے اور حبشہ کی طرف ہجرت سے پہلے اس سے حاملہ بھی ہو جائے۔ حالانکہ وہ بعثت کے بعد پیدا ہوئی تھی یہ بات واقعاً عجیب و غریب ہے۔

یہی مطلب اس امر کی بھی تصدیق اور تائید کرتا ہے کہ رقیہ جو عثمان کی بیوی تھی وہ اس رقیہ کے علاوہ تھی جس کے بارے میں ادعا کیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی بیٹی تھیں اور بعثت کے بعد متولد ہوئی تھیں۔ پس اس بنا پر عثمان سے شادی کرنے والی رقیہ آنحضرتؐ کی ربیبہ بیٹی ہو سکتی ہے نہ کہ آپؐ کی حقیقی بیٹی۔ البتہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ عرب کے لوگ انسان کی ربیبہ کو بھی اس کی بیٹی کہتے ہیں۔ ام کلثوم کے بارے میں بھی یہی جواب دیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی بعثت کے بعد پیدا ہوئیں۔ (پس وہ لڑکی جس نے دورِ جاہلیت میں ابو لہب کے بیٹے سے شادی کی ہو اور اسلام آنے کے بعد عثمان کی دوسری بیوی قرار پائی ہو، پیغمبر اسلامؐ کی بیٹی نہیں ہو سکتی)۔

۱۔ البدء و التاریخ ج ۵ ص ۱۶

کیا زینب رسول اللہ کی بیٹی تھی یا ربیبہ

ہم اطمینان اور یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ زینب آنحضرتؐ کی دختر تھی۔ اس کی چند وجوہات ہیں۔

۱۔ مغلطای حضرت خدیجہ (س) کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہے "پھر اس نے ابو ہالہ نباش بن زرارہ سے شادی کی اور اس شوہر سے اس کی اولاد ھند، حرث اور زینب ہوئی اور خود اس (خدیجہ) کی کنیت ام ھند قرار پائی اور اسے طاہرہ پکارا جانے لگا"۔ (۱)

۲۔ عمرو بن دینار روایت کرتا ہے کہ اسے حسن بن محمد بن علی نے خبر دی ہے کہ "ابوالعاص ابن ربیع بن عبدالعزیٰ بن عبدالشمس بن عبدمناف جو خدیجہ کی بیٹی کا شوہر تھا، قید ہو کر حضور اکرمؐ کے پاس لایا گیا جسے پیغمبرؐ کی دختر زینب نے آزاد کر دیا"۔ (۲)

اس میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے اس نے اسے خدیجہ کی بیٹی سے تعبیر کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ پیغمبرؐ کی بیٹی نہیں تھی اگرچہ بعد میں اسے رسول اللہ کی بیٹی کے طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اس کا مقصد یہ ہو کہ چونکہ آنحضرتؐ نے اسے پالا تھا اس لئے وہ باپ کا درجہ رکھتے تھے بصورت دیگر اس نے پہلے کیوں اسے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا سے نسبت دی ہے اور صرف ان کی بیٹی قرار دی۔

۳۔ شیخ محمد حسن آل یاسین زینب کے بارے میں کہتے ہیں کہ "بعض مآخذ کے مطابق جب آنحضرتؐ کی عمر مبارک ۳۰ سال تھی تو زینب پیدا ہوئی (۳) اور ابو العاص بن

۱۔ سیرۃ مغلطای ص ۱۲

۲۔ حافظ عبد الرزاق کی المصنف ج ۵ ص ۲۲۴

۳۔ اسد الغابۃ ج ۵ ص ۴۶۷، نہایۃ الارب ج ۱۸ ص ۲۱۱ اور الاستیعاب حاشیہ الاصابۃ ج ۴ ص ۳۱۱

ربیع نے اس سے قبل از بعثت شادی کی اور اس سے اس کے دو بچے پیدا ہوئے ایک کا نام علی تھا جو بچپنے میں فوت ہو گیا دوسرے کا نام امامہ تھا جو اسلام کی ابتداء میں ہی ماں کے ایمان لانے کے ساتھ ایمان لے آیا"۔ (۱)

یہ بات غیر معقول ہے کیونکہ ایک ۱۰ سالہ لڑکی کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس عمر میں شادی کرے اور ایک بچی کو جنم دے وہ اتنی بڑی بھی ہو جائے کہ بعثت کے آغاز میں ہی اپنی ماں کے ہمراہ ایمان بھی لے آئے۔ جبکہ خود اس کی یعنی ماں کی عمر کے ابھی ۱۰ سال بھی پورے نہ ہوئے ہوں۔ (۲)

ان مذکورہ مطالب کی وضاحت کے بعد ہم وثوق اور اعتماد سے یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ عثمان نے آنحضرتؐ کی دو بیٹیوں سے عقد کیا کیونکہ قوی احتمال یہ ہے کہ وہ آپؐ کی ربیبہ (لے پالک) بیٹیاں تھیں۔ اور اسی طرح یہ نسبت دینا کہ زینب ابو العاص کی زوجہ تھیں بھی اطمینان آور نہیں ہے۔

علیؑ کے رقیب

شاید دوسروں کی طرف سے ان کو رسولؐ اللہ کی بیٹیاں ثابت کرنے کا اور اسے مسلمات میں سمجھنے کا سبب حضرت علی علیہ السلام کے بیرونی فضائل کے مقابلے میں رقیب سازی ہو۔ اسی وجہ سے انہوں نے عثمان کو "ذو النورین" کے لقب سے نوازا ہے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ ان دو بیویوں کے ساتھ عثمان کا وہ رویہ نہ تھا جس طرح یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں جیساکہ ہم ان دونوں کی وفات کے حوالے سے گفتگو میں اس طرف اشارہ کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

۱۔ کتاب النبوۃ حاشیہ ص ۶۵

۲۔ کتاب النبوۃ پر شیخ محمد آل یاسین کے حاشیے ص ۶۵ کی طرف رجوع کریں۔

یہیں اس خود ساختہ روایت کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے حضرت علیؑ کے ساتھ ابو جہل کی لڑکی کی شادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں رسولؐ اللہ نے ابو العاص کی آپ سے دامادی کو سراہا اور یہ علیؑ پر تعریض کرنے کے لئے ہے۔ وہی علیؑ جس کی عیب جوئی اور بے حرمتی بیان کرنے کے وہ درپے تھے۔ اس جعلی حدیث کے متعلق بھی ہم بہت جلد گفتگو کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

رسول اللہ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہؑ کی عمر

حضور اکرمؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی عمر کیا تھی؟ اس بارے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض ان کی عمر ۲۵ سال بتاتے ہیں، بعض ۲۸ سال، کچھ ۳۰ سال، کچھ ۳۵ سال اور کچھ ۴۰ سال بیان کرتے ہیں، اور ایک گروہ ۴۵ سال ذکر کرتا ہے۔ (۱) کچھ افراد پہلے قول کو ترجیح دیتے ہیں (۲) جبکہ موٴرخین کے درمیان قول پنجم مشہور ہے اور اکثر اسی کو پسند کرتے ہیں۔

امیر المومنینؑ کی تاریخ ولادت

حضرت علیؑ کی تاریخ ولادت کے بارے میں تقریباً بارہ قول موجود ہیں جن میں آپ کی تاریخ ولادت ۷ سال قبل از بعثت سے لے کر ۱۶ سال قبل از بعثت تک بتائی گئی ہے۔

۱۔ تاریخ الخمیس ج۱ ص ۲۶۴، سیرۃ حلبیۃ ج۱ ص ۱۴۰، سیرۃ مغلطای ص ۱۲ بحار الانوار ج۱۶ ص ۱۲ و ۱۹ اور البدایہ و النہایۃ ج۲ ص ۲۹۵ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ جلال مظہر نے اپنی کتاب "محمد رسول اللہ، سیرتہ و اثرہ فی الحضارۃ" میں اسی قول کو اختیار کیا ہے لیکن اس ترجیح کی کوئی وجہ بیان نہیں کی۔

کچھ تو ۲۰ سال اور بعض ۲۲ سال قبل از بعثت بھی بتاتے ہیں۔ (۱)

۱۔ مذکورہ اقوال کو کلی یا جزئی طور پر مندرجہ ذیل کتب میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

* عبد الرزاق کی کتاب المصنف ج ۵، عقد الفرید ج ۳ ص ۳۱۱، انساب الاشراف، مقاتل الطالبیین ص ۲۶، الانس الجلیل ج ۱ ص ۱۷۸، التھذیب ج ۷ ص ۳۳۶، الاوائل، تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۷۹ نے شواہد النبوۃ سے نقل کیا ہے، طبقات ابن سعد طبع لیدن ج ۳ ص ۱۳، ابن قتیبۃ کی المعارف ص ۵۱، حیات الحیوان ج ۱ ص ۵۴، بحار الانوار، ینابیع المودۃ، تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۳۳، ذخائر العقبی ص ۵۸، الاستیعاب، سنن البیھقی ج ۶ ص ۲۰۶، نزھۃ المجالس، مناقب الخوارزمی، اسد الغابۃ ج ۴ ص ۱۸-۱۶، البدایۃ و النھایۃ، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۰۲، فتح الباری ج ۷ ص ۵۷، احقاق الحق ج ۷ ص ۵۵۳-۵۳۸۔

* بعثت سے ۱۰ سال قبل والا قول ان کتب میں ذکر ہوا ہے: الفصول المھمۃ از ابن الصباغ ص ۱۲، الاستیعاب ج ۳ ص ۳۰ ط صادر، طبقات ابن سعد طبع مصر ج ۳ ص ۲۱، سیرۃ ابن ھشام ج ۱ ص ۲۶۲، الکافی ج ۱ ص ۳۷۶، ارشاد المفید ص ۹، اعلام الوری ص ۱۵۳، مناقب آل ابیطالب ج ۲ ص ۷۸، تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۸۶، مستدرک الحاکم ج ۳ ص ۱۱۱، تلخیص مستدرک ذھبی کے حاشیہ کے ساتھ، مناقب الخوارزمی ص ۱۷، تاریخ الخلفاء ص ۱۶۶، البدایۃ و النھایۃ ج ۳ ص ۲۶، ذخائر العقبی، انساب الاشراف اور احقاق الحق کے ملحقات کی ساتویں جلد۔

* قبل از بعثت ۱۲ سال پہلے والے قول کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں: البحار ج ۳۵ ص ۷، احقاق الحق ج ۷ ص ۵۳۹ از نہایۃ الارب ج ۸ ص ۱۸۱

ان اقوال کی تعداد بارہ سے کم ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہم یہ کہیں کہ بعثت سے پہلے ۱۲ سال والے نظریے اور ۱۵ سال والے نظریے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر دوسرے نظریے کا قائل نبوت کے پہلے تین سالوں کو شمار نہ کرتا ہو کیونکہ اس عرصے میں آنحضرتؐ نے آشکارا طور پر اسلام کی دعوت نہیں دی تھی اور شاید مکے میں آپؐ کی مدت نبوت کے بارے میں اختلاف (کہ وہ ۱۰ سال تھی یا ۱۳ سال) کا سبب بھی یہی نکتہ ہو۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا یہ نظریہ بھی ہے کہ اسلام کی خفیہ دعوت ۵ سال تک جاری رہی۔ اس نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سے اقوال میں موجود فرق کو کم کیا جاسکتا ہے اور اقوال کو یکجا کیا جا سکتا ہے لیکن بہرحال یہ صرف ایک احتمال ہی ہے۔

بہرحال اگرچہ ۱۲ سال والا نظریہ اہلبیتؑ سے نقل ہوا ہے لیکن اس کے مقابلے میں ایک اور قول بھی اہلبیت سے روایت ہوا ہے جس کے مطابق آپؐ کی ولادت بعثت سے ۱۰ سال قبل ہوئی۔ اور یہی قول ہمارے علماء اور دوسروں کے درمیان مشہور ہے جیساکہ مندرجہ بالا منابع سے ظاہر ہوتا ہے۔

اسی دلیل کی بنا پر ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہی نظریہ جو مشہور بھی ہے قابل اعتماد اور معتبر ہے بالخصوص جب یہ اہلبیتؑ جو سب سے اعلم ہیں، سے منقول ہو۔

اور الاستیعاب ج ۳ ص ۳۰۔

مذکورہ اقوال میں سے بہت سے مندرجہ ذیل منابع سے نقل کئے گئے ہیں:

* اکمال الرجال ص ۶۸۷، روضۃ الندیۃ ص ۱۳، احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۹۰، انباہ الرواۃ فی انباہ النحاۃ ج ۱ ص ۱۱، نہایۃ الارب ج ۸ ص ۱۸۱، المختصر فی اخبار البشر ج ۱ ص ۱۱۵، نظم درر السمطین ص ۸۱ اور ۸۲، ریاض النضرۃ ج ۲ ص ۱۵۶، الغرۃ المنیفۃ ص ۱۴۶، زرقانی کی شرح المواہب ج ۱ ص ۲۳۲، طبقات المالکیۃ ج ۲ ص ۴۱ اور المصباح الکبیر ص ۵۶۰۔

البتہ بعض افراد نے اس نظریے سے استفادہ کرتے ہوئے ایک مخصوص طرز فکر کے تحت خاص نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ علیؑ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے تھے تاکہ مردوں میں سے ابوبکر سب سے پہلے ایمان لانے والے بن جائیں۔

یہ بات کسی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ہم "حضرت علیؑ کے اسلام" کے عنوان کے ذیل میں بحث کریں گے۔

دو ہاشمیوں سے متولد ہونے والا پہلا ہاشمی

حضور اکرمؐ کے بعد افضل ترین ہستی جس نے دامن وحی میں پرورش پائی اور سینہ نبوت سے غذا حاصل کی جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کی شخصیت ہے، جو پہلے ہاشمی فرد تھے، جو ماں باپ دونوں کی طرف سے ہاشمی اور قریشی تھے، ان کے والد گرامی حضرت ابوطالب، شیخ الابطح تھے اور والدہ ماجدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھیں۔

جناب کلینی اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ "حضرت علی علیہ السلام وہ پہلے ہاشمی تھے، جو دو طرف سے ہاشمی تھے" اور اسی سے ملتے جلتے الفاظ دوسروں نے بھی ذکر کئے ہیں۔ (۱)

علامہ مجلسی نے اس بارے میں کہا ہے کہ حضرت علیؑ کس طرح پہلے ہاشمی الطرفین ہاشمی ہو سکتے ہیں جبکہ ان سے پہلے ان کے تین سگے بھائی طالب، عقیل اور جعفر پیدا ہو چکے تھے اور علیؑ کی ولادت کو اسلام سے مقید کرنا اعتراض کو حل نہیں کرتا جیساکہ شیخ طوسی نے تہذیب میں اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی کہا ہے۔ کیونکہ اگر مراد یہ ہو کہ علیؑ

۱۔ کافی ج ۱ ص ۴۵۲، مصعب زبیری کی نسب قریش ص ۱۷، شیخ طوسیؒ کی التہذیب ج ٦ ص ۱۹، البحار ج ۳۵ ص ۵ از تہذیب و کافی، اسد الغابہ ج ۴ ص ۱٦ اور ج ۵ ص ۵۱۷ اور ابن صباغ کی فصول المہمۃ ص ۱۳۔

بعثت پیغمبرؐ کے بعد دنیا میں تشریف لائے تو یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس پر سب متفق ہیں کہ ان کی ولادت بعثت سے پہلے ہوئی ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ رسول اللہ کی ولادت کے بعد بنی ہاشم میں فقط وہ پیدا ہوئے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے اکثر بھائی رسول اللہ کی ولادت کے بعد پیدا ہوئے تھے علاوہ ازیں یہ اصطلاح نامانوس اور غیر مشہور ہے"۔ (۱)

صحیح بات یہ ہے کہ "حضرت علی علیہ السلام کی مادر گرامی پہلی ہاشمی خاتون ہیں جس نے ہاشمی مرد سے ہاشمی بچے کو جنم دیا" جیساکہ یہی بات معتزلی، شہید اول اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی کہی ہے۔ (۲)

امیر المومنینؑ کی کعبہ میں ولادت

روایت ہے کہ حضرت علیؑ کی ولادت باسعادت خانہ کعبہ کے اندر ہوئی تھی۔ اللہ تعالی نے یہ فضیلت خصوصی طور پر انہیں عطا کی جو ان سے پہلے کسی کو حاصل تھی نہ ان کے بعد کسی کو حاصل ہوگی۔ اس حقیقت کو بڑے بڑے علماء اور راویان حدیث کی بہت بڑی تعداد نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شعراء اور ادباء نے اسے نظم و شعر میں پرویا ہے۔

۱۔ بحار ج ۳۵ ص ۶

۲۔ بحار (ج ۳۵ ص ۶) نے شہید اول کی کتاب دروس سے نقل کیا ہے، معتزلی کی شرح نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۱۴ اور ج ۱۵ ص ۲۷۸، البدء و التاریخ ج ۵ ص ۷۱ نسب قریش (مصعب کی کتاب) ص ۴۳۰، نزھۃ المجالس ج ۲ ص ۱۶۵، طوپ قپوسرای کی لائبریری میں موجود ابن نعیم کی خطی کتاب معرفۃ الصحابۃ نمبر ۸۴۹۷/۱ ورق نمبر ۱۹ نیز ذخائر العقبی ص ۵۵ اور ابن قتیبۃ کی المعارف ص ۸۸۔

شیعوں کے نزدیک یہ روایت مستفیضہ ہے اسی طرح غیر کتب شیعہ میں بھی یہ روایت مستفیض صورت میں ذکر ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ حاکم اور دوسرے حضرات اس بارے میں یوں کہتے ہیں: "اس بات پر کہ حضرت فاطمہ بنت اسد نے حضرت علی ابن ابیطالب کرم اللہ وجہہ کو کعبہ کے اندر جنم دیا روایات متواتر ہیں"۔

علماء اور مؤرخین کی ایک تعداد نے بطور صریح بیان کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے سوا کوئی بچہ بھی کعبہ میں پیدا نہیں ہوا۔ (۱)

۱۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل کتب کی طرف رجوع کریں:

* مستدرک الحاکم ج ۳ ص ۴۸۳، تلخیص مستدرک کے اسی صفحہ کا حاشیہ، نور الابصار ص ۷۶، ابن صباغ کی فصول المہمۃ ص ۱۲، گنجی شافعی کی کفایۃ الطالب ص ۴۰۷، ابن مغازلی کی مناقب الامام امیرالمؤمنین ص ۷، اس میں ان کی ولادت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اسد الغابۃ ج ۴ ص ۳۱، سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۹، نزھۃ المجالس ج ۲ ص ۲۰۴، تذکرۃ الخواص ص ۱۰، صاحب غدیر نے اپنی کتاب ج ٦ کے ص ۳۸-۲۲ پر دسیوں مصادر سے نقل کیا ہے مثلاً دھلوی کی ازالۃ الخفاء، الالوسی فی شرح الخریدۃ الغیبۃ ص ۱۵، مروج الذھب ج ۲ ص ۲، شرح الشفاء ج ۱ ص ۱۵۱، محمد صالح ترمذی کی المناقب لمحمد، آئینہ تصوف ص ۱۳۱۱، روائح المصطفی ص ۱۰، سید علی جلال الدین کی کتاب الحسین ج۱ ص ۱٦ اسی طرح اس نے دسیوں امامیہ کتب کا بھی حوالہ دیا ہے۔
* ملاحظہ کریں: احقاق الحق پر سید نجفی کا تعلیقہ ج ۷ ص ۴۹۰-۴۸٦، ارجح المطالب ص ۳۸۸ سے نقل کرتے ہیں۔ محاضرۃ الأوائل ص ۷۹، بلخی اپنی کتاب (طبع بمبئی کی) تلخیص ص ۱۱، ابن طلحۃ کی مطالب السئول ص ۱۱،

سید حمیری (متوفی ۱۷۳ ہجری) کہتے ہیں:

ولدته فی حرم الالہ و امنہ و البیت حیث فناؤہ و المسجد

۔ اس کی ماں نے اسے (علیؑ کو) حرم امن الٰہی اور اللہ کے گھر میں پیدا کیا جہاں پر اطراف میں مسجد تھی۔

عبد الباقی العمری کہتے ہیں:

انت العلی الذی فوق العلی رفعا ببطن مکۃ وسط البیت اذ وضعا

۔ تو وہ علی ہے جو ہر بلندی سے بالا ہے کیونکہ تو مکہ میں خانہ خدا کے وسط میں پیدا ہوا ہے۔

لیکن علیؑ کے دشمن اپنے بغض و کینہ کی وجہ سے ان کی اس فضیلت پر جو اللہ تعالیٰ نے ان سے مختص کی ہے، ان سے حسد کرنے لگے اور اسی بات کے پیش نظر انھوں نے اس بارے میں علماء، مورخین اور راویان حدیث کے نظریات کو یکسر ٹھکرا دیا اور ان کی آراء کو دیوار پر دے مارا۔

جیساکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کمال دیدہ دلیری اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس فضیلت کو حضرت علیؑ کے سوا دوسروں کیلئے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو چیز حضرت علیؑ کیلئے ثابت ہے اس میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔ کتاب نور کا مصنف لکھتا ہے: "حکیم بن حزام

قفال شافعی کی فضائل امیرالمؤمنینؑ (خطی نسخہ)، مفتاح النجاء ص ۲۰ (خطی) اعلام الوری ص ۹۳، اسی طرح الاستیعاب شواہد النبوۃ و کنوز الحقایق سے بھی نقل ہوا ہے۔

* اس مسئلے میں مکمل طور پر مآخذ اور منابع کی تحقیق کرنا اختصار کے پیش نظر یہاں پر ایک مشکل کام ہے یہاں پر جو کچھ کیا گیا ہے وہ اہل حق اور حق کے متلاشی کے لئے کفایت کرتا ہے۔

کعبہ کے اندر پیدا ہوا اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں ہم نہیں جانتے اور جو کچھ علیؑ کے متعلق نقل ہوا کہ وہ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے وہ علماء کے نزدیک ضعیف ہے"۔ (۱)

اس کے بعد حلبی اور دیار بکری نے ان دو نظریات کو آپس میں جمع کرنے اور سازگار بنانے کی کوشش کی اور یہ احتمال دیا کہ ممکن ہے دونوں کی ولادت کعبہ میں ہوئی ہو۔ (۲)

لیکن جناب حلبی اور جناب دیار بکری، ایسا نہیں ہے۔ ان دو نظریات کے درمیان توافق کیونکر ممکن ہے جبکہ علماء کی ایک بہت بڑی تعداد جن کے نام ہم نے ابھی ذکر کئے ہیں اور دوسرے علماء جن کے نام الغدیر اور دوسری کتب میں مذکور ہیں، اس بات پر مصر ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے سوا کوئی بھی کعبہ میں پیدا نہیں ہوا نہ ان سے پہلے اور نہ بعد میں۔ اور یہ ایک ایسی فضیلت تھی جسے عالم انسانیت میں اللہ تعالی نے صرف علیؑ سے مختص کیا ہے۔ آپ کس بنیاد پر ان دو نظریوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حاکم صریحاً کہتا ہے کہ امیر المومنین علیؑ کی خانہ کعبہ میں ولادت کے بارے میں روایات متواتر ہیں۔

حکیم بن حزام کیوں؟!

حکیم بن حزام کیلئے اس فضیلت کو ثابت کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ زبیریوں کو اس بات سے غرض تھی، کیونکہ وہ زبیر کا چچازاد بھائی ہے اور چچازاد ہونا زبیر کی اولاد کے برابر ہے، وہ حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ ہے اور زبیریوں کا سلسلہ نسب بھی اسد بن عبدالعزیٰ پر ختم ہوتا ہے۔ حکیم فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوا۔ اس کا شمار "مولفۃ

۱۔ دیکھئے سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۹ کعبہ میں انکی ولادت کا ذکر ان کتب میں بھی موجود ہے۔ اسد الغابۃ ج ۲ ص ۴۰، الاصابۃ ج ۱ ص ۳۴۹ اور الاستیعاب حاشیہ الاصابۃ ج ۱ ص ۳۲۰

۲۔ تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۷۹ اور سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۹۔

قلوبہم" میں ہوتا ہے۔ (۱)

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اناج کی ذخیرہ اندوزی کرتا تھا، (۲) حضرت عثمان کا زبردست حامی تھا، اور طبری کی تعبیر کے مطابق اس نے حضرت علیؑ سے کنارہ کشی اختیار کی اور کسی بھی جنگ میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوا۔ (۳)

اس صورت حال میں زبیر بن بکار اور مصعب بن عبداللہ (۴) کہ جن کے زبیری اغراض کے حامل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، کیوں نہ یہ روایت کریں کہ حکیم کے سوا کوئی اور کعبہ میں پیدا نہیں ہوا۔ اگرچہ ان کی یہ بات تمام متواتر روایات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور ان تمام اقوال کے برخلاف ہو جو صریحاً یہ کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں امیرالمومنین علیؑ سے پہلے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی بعد میں۔

خانہ کعبہ کی تعمیر

کہا جاتا ہے کہ مکہ میں ایک زبردست سیلاب آیا اور کعبہ کے اردگرد سیلاب سے حفاظت کے لئے جو بند بنایا گیا تھا اسے توڑ کر سیلاب کعبہ میں داخل ہوگیا اور اس کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے (دراڑیں ڈال دیں)۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے ایک خاتون، خانہ کعبہ کو "عود" (اگرتی) کے دھوئیں سے یا کسی اور چیز سے خوشبو لگانا چاہ رہی تھی کہ اچانک ایک چنگاری کعبہ کے غلاف پر جا پڑی اور اسے آگ لگ گئی اس کی وجہ سے کعبہ کی دیواروں کو کافی نقصان پہنچا۔ (۵) اس واقعہ کے بعد سیلاب آیا جس کی وجہ سے دیواریں مزید

۱۔ الاصابۃ ج ۱ ص ۳۴۹، الاستیعاب ج ۱ ص ۳۲۰ (اصابۃ کا حاشیہ)۔

۲۔ وسائل الشیعہ کتاب تجارت ص ۳۱۶

۳۔ قاموس الرجال ج ۳ ص ۳۸۷

۴۔ الاصابۃ ج ۱ ص ۳۴۹ اور مستدرک حاکم ج ۳ ص ۴۸۳

خراب ہوگئیں یہاں تک کہ کسی وقت بھی ان کے گرنے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ آتشزدگی کا واقعہ ابن زبیر کے دور میں وقوع پذیر ہوا۔ مشہور مورخ حلبی نے اس احتمال کی بنا پر کہ دو بار آتشزدگی ہوئی ہو ان دو اقوال کے باہمی تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۱)

ہم یہ کہتے ہیں کہ آتشزدگی کے واقعے کو ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے کی وجہ بنی امیہ کے خلاف اس نفرت اور غصے کی شدت میں کمی پیدا کرنا ہے جو ان کی خانہ کعبہ کی بے حرمتی اور بے ادبی کرنے کی وجہ سے لوگوں میں نفوذ کر گئی تھی۔ انھوں نے پہلے تو خانہ کعبہ پر منجنیق سے حملہ کیا اور پھر اسے آگ لگا دی (کعبہ کی دیواروں میں شگاف کی وجہ بھی تھی)۔ ابن زبیر نے جلتی ہوئی حالت میں خانہ کعبہ کو چھوڑا تاکہ لوگ اسے جلتا ہوا دیکھ لیں اور پھر اسی بات کو بنیاد بنا کر وہ لوگوں کو اہل شام کے خلاف ابھار سکے۔ (۲)

بہرحال ماجرا جو بھی ہو، رسول اکرمؐ کی بعثت سے پہلے قریش اس بات پر متفق تھے کہ خانہ کعبہ کی پرانی عمارت کو گرا کر اسے نئے سرے سے تعمیر کیا جائے اور اسکے دروازے کو بلند کیا جائے تاکہ جسے وہ چاہیں صرف وہی کعبہ کے اندر داخل ہو اور اسکے علاوہ کوئی اور

۵۔ عبدالرزاق کی کتاب المصنف ج۵ ص ۳۱۹؛ البدایة والنھایة ج۲ ص ۳۰۰ (دونوں نے زھری سے نقل کیا ہے)۔

۱۔ سیرة حلبیة ج ۱ ص ۱۴۱

۲۔ صحیح مسلم حاشیہ القسطلانی ج ۶ ص ۱۸؛ ابن اثیر کی الکامل ج ۴ ص ۱۲۴ اور کامل میں بخاری سے ایک اور قول بھی نقل ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ ابن زبیر کے دور میں جو آگ لگی تھی اس کی وجہ ابن زبیر کے ساتھیوں کا کعبہ کے اردگرد آگ کا جلانا تھا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسے اقوال ذریعے سے بنی امیہؓ اپنے جرائم کو ابن زبیر اور اس کے ساتھیوں کے سر تھونپنا چاہتے ہیں۔

داخل نہ ہوسکے۔ اس کام کیلئے انھوں نے حلال رقم مہیا کی جو زنا، ربا و لوٹ مار سے حاصل نہیں ہوئی تھی یا قطع رحمی، ہتک حرمت یا کسی دوسرے کے ذمہ کا موجب بھی نہیں تھی۔ (۱)

ہر قبیلے نے اپنے طور پر پتھروں کی جمع آوری شروع کی اور آپؐ بھی پتھر جمع کرنے میں شریک تھے۔ ولید بن مغیرہ پہلا شخص تھا جس نے کعبہ کو گرانے کی ہمت بدھوائی۔

قریش نے بیت اللہ کے گرانے اور جدید تعمیر کے کاموں کو مختلف قبائل کے درمیان تقسیم کر دیا اور ہر قبیلے کے لئے ایک مخصوص حصہ دیا گیا اب رہا یہ مسئلہ کہ کونسا حصہ کس کس قبیلے کے ذمے لگا اس بارے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ (۲) اور اس بات کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے کہ ان میں سے ہم کسی قول کی نفی کریں یا اس کی تائید کریں خصوصاً ایسے موارد میں جہاں ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسی چیز کو حاصل کرے جو اس کی عظمت اور شرافت کا موجب بنے۔

خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی تاریخ کے بارے میں بھی مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ "اس کی تعمیر حضرت رسول خداؐ کے بلوغ کے زمانے میں ہوئی یعنی عام الفیل کے ۱۵ سال بعد ہوئی"۔ (۳) دوسرا قول یہ ہے کہ تعمیر کا واقعہ عام الفیل کے ۲۵ سال بعد وقوع پذیر ہوا۔ (۴) تیسرا قول یہ ہے کہ سن ۳۵ عام الفیل میں تعمیر واقع ہوئی یعنی بعثت سے پانچ سال قبل۔ (۵)

۱۔ سیرۃ ابن هشام ج۱ ص ۲۰۶ البدایۃ والنہایۃ ج۲ ص ۳۰۱ سیرۃ حلبیۃ ج۱ ص ۱۳۱

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ج۱ ص ۲۰۷ البدایہ والنہایۃ ج۲ ص ۳۰۲ سیرۃ حلبیۃ ج۱ ص ۱۳۳

۳۔ عبدالرزاق کی کتاب ج۵ ص ۳۱۸ البدایۃ والنہایۃ ج۲ ص ۳۰۰

۴۔ البدایۃ والنہایۃ ج۲ ص ۳۰۰ (موسی بن عقبہ، مجاہد، عروہ اور محمد بن جبیر بن مطعم سے نقل کیا ہے)، تاریخ خمیس ج ۱ ص ۲۷۹ عن تاریخ یعقوب۔

۵۔ ابن ہشام کی سیرۃ نبویۃ ج ۱ ص ۲۰۴، البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۳۰۰

حجرالاسود کی تنصیب

جب بیت اللہ کی تعمیر کا کام حجر اسود کے نصب کرنے تک پہنچا تو قریش کے درمیان جھگڑا پیدا ہوگیا۔ ہر قبیلے کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس مقدس کام کی سعادت حاصل کرے۔ یہاں تک کہ نوبت تلواروں تک پہنچنے کے قریب ہوئی۔ اسی موقعہ پر بنی عبدالدار اور بنی عدی کے افراد خون سے بھرے ہوئے برتن اپنے ساتھ لائے انہوں نے اپنے ہاتھ خون میں ڈبو کر قسم کھائی کہ اپنے خون کے آخری قطرے تک ڈٹے رہیں گے۔ بنی سہم اور بنی مخزوم بھی ان کے ساتھ ہوگئے۔ (۱) یہیں سے انہیں "لعقة الدم" یعنی خون چاٹنے والے کہا جانے لگا۔ (۲)

جب نوبت یہاں تک آن پہنچی تو ابوامیہ بن المغیرہ (ام المومنین حضرت ام سلمہ کے والد، جو قریش کے اہل سخاء میں سے تھے۔ بلاذری کہتا ہے کہ وہ ابو حشم بن المغیرۃ تھے) نے اکی اسطرح راہنمائی کی کہ باب السلام سے جو بھی پہلے داخل ہو وہ اس بات کا فیصلہ کرے۔ باب السلام - وہی باب بنی شیبہ - یا بقولے جو باب صفا سے داخل ہو وہ فیصلہ کرے۔

اسی وقت رسولؐ اللہ سب سے پہلے اس دروازے سے اندر داخل ہوئے جب انہوں نے دیکھا تو کہنے لگے یہ تو امین ہے ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں، یہ محمدؐ ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ دور جاہلیت میں قریش اپنے جھگڑوں کو حل کرانے کے لئے نبی اکرمؐ کی خدمت میں آتے تھے کیونکہ وہ فیصلہ کرتے وقت کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہ ہی وہ کسی سے جھگڑا کرتے تھے۔ (۳)

۱۔ شرح نہج البلاغة معتزلی ج ۱۴ ص ۱۲۹

۲۔ ابن ہشام کی سیرۃ نبویة ج ۱ ص ۲۰۹، البدایة و النہایة ج ۲ ص ۳۰۳

۳۔ سیرۃ حلبیة ج ۱ ص ۱۴۵

جب انھوں نے حضور اکرمؐ کے سامنے سارا قصہ بیان کیا تو آپؐ نے ایک کپڑا طلب کیا یا اپنے قمیص کو پھیلایا (البتہ اس بارے میں اقوال مختلف ہیں) اور پھر اپنے ہاتھوں سے پتھر کو اٹھا کر اس کپڑے میں رکھ دیا اور ہر قبیلے سے کہا کہ وہ اس کا ایک ایک کونہ پکڑ لیں پھر سب نے مل کر اوپر اٹھایا جب اس مقام تک اوپر لے گئے جہاں حجر الاسود کو رکھنا تھا تو آنحضرتؐ نے اپنے دست مبارک سے اسے اٹھایا اور اس کے مقام پر رکھ دیا۔

اہم نکات

ا۔ بنی عبدالدار کے ساتھ بنی سہم، بنی مخزوم اور بنی عدی نے خون میں ہاتھ ڈبو کر قسم کھائی کہ ہم اپنے حق کی خاطر موت آنے تک قدم جمائے رکھیں گے ان کے مقابلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنی عبد مناف قصی کے دور میں غالیہ (عطر کی ایک قسم) لے کر آئے اور اس میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے حلف اٹھایا اور اس حلف کو "حلف المطیبین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی بنی عبد مناف نے ایک اور پیمان بھی باندھا جو عرب معاہدوں میں معزز ترین اور گرامی ترین معاہدہ شمار ہوتا ہے۔ (ا) یہ وہی حلف الفضول ہے جس کی اسلام نے بھی تائید کی ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ جبکہ ان کے مقابلے پر حلف الاحلاف ہے جو بنی عبد الدار، سہم، جمح، مخزوم اور عدی کے درمیان طے پایا تھا ان کا مقصد دنیوی مقام حاصل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اگرچہ اس کی قیمت، خون بہا کر یا جان گنوا کر ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔ اور اسی نکتے سے دونوں فریقوں کے طرز فکر، نظریہ زندگی اور فکری بیداری میں فرق کو واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

اس بات میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ کتب تاریخ اور الانساب کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بنی عبد مناف بالخصوص آل ابیطالب

ا۔ البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۹۱

اسلام کی اہم شخصیات تھے وہ راہ حق کی ہدایت کرنے والے اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ جبکہ بنی عبدالدار اور ان کے حلیف دین اور راہ خدا میں ایثار اور قربانی کے حوالے سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں بلکہ ان میں دین سے دشمنی اور بغض و عناد رکھنے والے افراد کثرت سے ملتے ہیں۔

۲۔ قریش کا یہ شرط کرنا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے اخراجات کے لئے سود، ظلم وغیرہ سے پاک رقم ہونی چاہئے اگر یہ شرط کسی بات پر دلالت کرتی ہے تو بے شک ان امور کی قباحت کے بارے میں ان کے حقیقی شعور پر دلالت بھی کرتی ہے نیز خدا اور ضمیر کے نزدیک ان کی قباحت کو بیان کرتی ہے۔ اور اسی مطلب کی تعبیر کبھی "فطرت کے تقاضے" اور "حکم عقل" کہہ کر کی جاتی ہے۔

اگرچہ ہماری نظر میں بات یہی ہے اور بنیادی طور پر دین کے تمام احکام حکم عقل اور فطرت سے ہم آہنگ ہیں لیکن یہاں پر ایک بات کا اضافہ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ قریش کا اس طرح سے شرط کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ابھی تک دین حنیف (دین ابراہیم) کی تعلیمات کے اثرات ان میں باقی تھے خصوصاً قریش اور بنی عبد مناف کے اندر۔ اسی لئے حضرت عبدالمطلب اور حضرت ابوطالب کے کلمات اور اقوال میں دین ابراہیمؑ اور ایسے امور کی طرف جو ان کے خدا پر ایمان پر دلالت کرتے ہیں، اشارے بکثرت ملتے ہیں۔ حضرت رسول اکرمؐ کے لئے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا رشتہ مانگتے وقت حضرت ابوطالب نے جو خطبہ پڑھا تھا اس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔

۳۔ جو کچھ گزر چکا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مکہ کے لوگ اسی بیت اللہ کی تعمیر اور اس کے لئے پتھر اٹھانے کے معاملے میں بھی قبیلہ پرستی پر مبنی طرز عمل اپناتے تھے جبکہ یہ کام ان کے مقدس ترین اعمال میں سے تھا اور ان کی عزت و عظمت کا موجب تھا بلکہ ان کی حیات اس سے وابستہ تھی۔ حجر الاسود کے نصب کرنے کے موقعہ پر لعقۃ الدم (خون چاٹنے والوں) کا پیمان اس بات پر بہترین گواہ ہے اور یہی پیمان جو عقل

سلیم، فطرت اور ذوق انسانی کے نزدیک مغفور اور مردود ہے۔

۲۔ جو چیز ہماری نظروں میں قابل توجہ ہے وہ قریش کا اظہار مسرت ہے جو انھوں نے حضرت محمدؐ کے سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہونے پر کیا۔ پھر انھوں نے آنحضرتؐ کو امین کی صفت سے یاد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ مکہ کے لوگوں کے درمیان خاص مقام حاصل کر چکے تھے باوجود اس کے کہ آپ تمام عرب قبائل کے سردار قبیلہ قریش میں زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے بہت سے لڑائی جھگڑوں میں آنحضرتؐ کے فیصلے اور رائے پر راضی ہوتے تھے ان تمام کا اعتماد و اطمینان آپؐ کی ذات پر منتہی ہوتا تھا اور وہ لوگ آپؐ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابوطالب کے گذشتہ کلمات اس مطلب پر بہترین شاہد ہیں کہ آنحضرتؐ ان کے درمیان بلند مقام و منزلت پر فائز تھے اور سب کی نظروں میں معزز اور محترم تھے۔ البتہ بعض ایسی نفرت آمیز اور قبیح باتیں ذکر کی گئی ہیں جو کسی لحاظ سے بھی آنحضرتؐ کے مقام شامخ سے سازگار نہیں ہیں۔

ایک جسارت

مذکورہ باتوں کے بعد ہمیں ایک بے بنیاد اور شرمناک جھوٹ کا سامنا ہوتا ہے جس کا ہدف صرف اور صرف آنحضرتؐ کی عزت و شرافت کو داغدار بنانا اور آپؐ کی ذات اقدس کی شان میں گستاخی اور جسارت کرنا ہے۔

یہ افتراء ان لوگوں کی طرف سے باندھا گیا ہے جن کے دلوں میں ابھی ایمان داخل نہیں ہوا تھا اور وہ اسلام نہیں لائے تھے بلکہ وہ نام کے مسلمان تھے انھوں نے حضرت محمدؐ کے ذکر، نام اور دین کو مٹانے کی قسم اٹھا رکھی تھی لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نور کو مٹنے سے محفوظ کر رکھا ہے اگرچہ یہ کافروں پر ناگوار گزرے۔

یہ جھوٹ ان سیکڑوں جھوٹوں میں سے ایک ہے جنھیں سن کر انسان کا بدن کانپ

جاتا ہے اور خدا کا غضب جوش میں آ جاتا ہے۔ یہ جھوٹ یوں ہے۔

بخاری و مسلم اور تاریخ و حدیث کے دیگر مولفین نے ان لوگوں سے جو جھوٹ گھڑنے اور دین و سیاست کے کھیل میں ان کے ساتھ قدر مشترک رکھتے ہیں، ایک روایت نقل کی ہے۔ کتاب بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔ "رسول اللہؐ باقی لوگوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر کے لئے پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے جبکہ انھوں نے تہبند باندھ رکھا تھا۔ آنحضرتؐ سے ان کے چچا عباس نے کہا اے بھتیجے! اگر آپ چاہیں تو اپنا تہبند اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لیں اور کپڑے کے اوپر پتھر اٹھا کر لائیں۔ راوی کہتا ہے کہ آپؐ نے اپنا تہبند کھولا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے بعد آپؐ غش کھا گئے۔ اس واقعہ کے بعد پھر کبھی انہیں عریاں نہ دیکھا گیا"۔ (۱)

بخاری کے باب حج میں ایک اور روایت نقل کی گئی ہے۔ "پس آپؐ زمین پر گر گئے اور آپؐ کی آنکھیں تاریک ہوگئیں پھر آپؐ نے چچا سے کہا میرا تہبند مجھے دے دو انھوں نے آپؐ کا تہبند باندھ دیا"۔

ہمارے نزدیک اس افسانے کے جعلی اور خود ساختہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہاں پر ہم درج ذیل نکات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ اس واقعے سے مربوط روایات میں بہت زیادہ تناقض پایا جاتا ہے جو ہمیں اس ضرب المثل کی یاد دلاتا ہے کہ "جھوٹے آدمی کا حافظہ نہیں ہوتا"، یہاں پر ہم اس تضاد بیانی کا ایک نمونہ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ البخاری طبع ۱۳۰۹ھ باب: حالت نماز میں عریان ہونے کی کراہت ج ۱ ص ۵۰ و ۱۸۱ اور ج ۲ ص ۲۰۳ صحیح مسلم ط ۱۳۳۴ھ ج ۱ ص ۱۸۴، مسند احمد ج ۳ ص ۲۹۵ و ۳۱۰ و ۳۳۳ و ج ۵ ص ۴۵۴ اور ۴۵۵ المصنف ج ۵ ص ۱۰۳ ، البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۸۷ (صحیحین اور بیقہی سے نقل کیا ہے)

ایک روایت کہتی ہے کہ ان کا عریاں ہونا بچپن کے زمانے میں وقوع پذیر ہوا جب آپؐ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ تمام بچے برہنہ تھے اور وہ بھی کھیل کے لئے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے، اس دوران ایک غیبی ہاتھ آپؐ پر پڑا اور آپؐ سے کہا کہ اپنا تہبند باندھ لو۔ (۱)

ایک اور روایت میں نقل ہوا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپؐ کے چچا حضرت ابو طالب زم زم کے کنویں کو درست کر رہے تھے، غیب سے کسی شخص نے آپؐ کو پاجامہ پہننے کو کہا۔ (۲)

تیسری روایت یہ بیان کرتی ہے کہ یہ واقعہ خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کے موقع پر رونما ہوا (اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آپکی عمر ۳۵ سال تھی۔

اس تضاد اور تناقض کی ایک اور شاخ یہ ہے کہ ایک روایت کہتی ہے کہ چونکہ آپؐ کو لباس کی وجہ سے کام کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی لہذا آپؐ نے لباس نیچے سے اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا جس کی وجہ سے آپؐ کی شرمگاہ ظاہر ہوگئی کیونکہ لباس چھوٹا ہوگیا۔ یہاں پر ایک غیبی آواز آئی کہ اے محمد (ص)! اپنی شرمگاہ کو چھپاؤ، اس کے بعد پھر کبھی آپؐ عریاں نہیں ہوئے۔ (۳) دوسری روایت یوں ذکر کرتی ہے کہ عباس نے آپؐ سے کہا کہ اپنے تہبند کو گردن میں ڈال لو۔ (۴)

۱۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۲، فتح الباری ج ۷ ص ۱۱۱ (ابن اسحاق سے نقل کیا ہے) سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۳ اور البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۸۷

۲۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۳۲ اور ۱۲۲

۳۔ مسند احمد ج ۵ ص ۴۵۵ اور عبدالرزاق کی کتاب ج ۵ ص ۱۰۳

۴۔ کیونکہ ممکن ہے اس کا جواب دیا جائے کہ عباس نے دیکھا کہ لمبے لباس کے ساتھ کام کرنے میں دشواری ہو رہی ہے لہذا انہوں آپ کو یہ مشورہ دیا اور آپ نے بھی قبول کر لیا۔

ایک روایت کہتی ہے کہ آپ گر گئے، دوسری کہتی ہے کہ غیبی ہاتھ ان پر پڑا، تیسری بیان کرتی ہے کہ آپ غش کھا گئے، اسی طرح اور بہت سے تضادات موجود ہیں۔

آخر میں ہم یہ بیان کرتے چلیں کہ عسقلانی اور حلبی ان روایات کے تضاد کو ختم کرنے کے درپے ہوئے ہیں۔

عسقلانی کہتے ہیں "سابقہ نہی سے (چاہ زم زم کی کھدائی کے موقع پر بچپن کے زمانے میں) یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ حکم، اضطراری صورتوں کو بھی شامل ہو (یعنی ایسے موارد سے نہی نہیں کی گئی) جبکہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر رسولخداؐ کیلئے اضطراری صورت پیش آگئی تھی پس انہوں نے برہنہ ہونے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کی تھی"۔ (۱)

یہ سب کچھ اس لئے ہے تاکہ اس غیر اخلاقی فعل کو رسول اکرمؐ کیلئے ثابت کیا جائے کیونکہ یہ بات صحیح بخاری میں ذکر ہوئی ہے جو انکے ہاں ایک مقدس کتاب اور قرآن کے بعد سب کتب سے زیادہ صحیح کتاب ہے بلکہ انکے نزدیک قرآن تحریف اور نسخ شدہ ہے لیکن بخاری ان چیزوں سے بالاتر ہے۔

البتہ یہاں پر عسقلانی نے وہ بات فراموش کردی ہے جو ابی طفیل سے منقول روایت میں بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "پیغمبر اکرمؐ کی شرمگاہ کبھی بھی ظاہر نہیں ہوئی نہ پہلے نہ بعد میں"۔ (۲) ان سب کے علاوہ خود عسقلانی نے ذکر کیا ہے کہ "نبی اکرمؐ بعثت سے پہلے اور بعد میں تمام برائیوں اور بداخلاقیوں سے پاکیزہ تھے"۔ (۳)

حلبی نے اس بارے میں یوں کہا ہے کہ "ممکن ہے آپؐ کی شرمگاہ عریان ہوگئی ہو لیکن اسے کسی نے نہ دیکھا ہو حتی خود حضرت عباس نے بھی"۔ (۴) لیکن حلبی، صحیح بخاری اور اس کے علاوہ دیگر کتب کی ان عبارات کے ساتھ کیا کریں گے جو صراحت کے

۱۔ فتح الباری ج ۱ ص ۳۰۱ ۲۔ فتح الباری ج ۷ ص ۱۱۱

۳۔ فتح الباری ج ۱ ص ۳۰۱ ۴۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۴۲

ساتھ بیان کرتی ہیں کہ "اس کے بعد پھر آپ کبھی عریان نہیں ہوئے"۔ اسی طرح ابی طفیل سے منقول اس روایت کا کیا کریں گے جو یہ کہتی ہے کہ "آپ کی شرمگاہ نہ پہلے اور نہ ہی بعد میں دکھائی دی"۔

۲۔اس واقعے کے جھوٹے ہونے پر جو امور دلالت کرتے ہیں ان میں ایک یہ روایت ہے جو خود آنحضرتؐ سے منقول ہے گویا آپؐ مستقبل قریب میں اپنی طرف نسبت دی جانے والی ناروا تہمتوں کی پیشگوئی کر رہے تھے۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالی کی عنایات و الطاف جو اس نے مجھ پر جاری کئے ہیں سے ایک یہ ہے کہ کسی نے بھی میری شرمگاہ کو نہیں دیکھا ... یا اس سے قریب عبارت"۔ (۱)

۳۔ حضرت ابو طالبؑ بیت اللہ کی مرمت سے دس سال پہلے آنحضرتؐ کی شخصیت کے متعلق یوں کہتے ہیں کہ "آپؐ کا کسی شخص سے بھی موازنہ نہیں کیا جا سکتا جس سے بھی موازنہ کیا جائے آپؐ اس سے بلند و برتر ہوں گے کوئی بھی ان سے بڑا نہیں ہے جس پر آپؐ کو قیاس کیا جائے ..."۔ پس اس عظمت و فضیلت کا حامل انسان لوگوں کے سامنے کعبہ کے لئے پتھر اٹھانے کے موقع پر اپنے آپ کو برہنہ کر لے یہ کس طرح ممکن ہے؟!

۴۔ اس بارے میں روایات نقل ہوئی ہیں کہ آنحضرتؐ اس لحاظ سے مصون تھے کہ آپؐ کی شرمگاہ کسی نے نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ آپؐ کی ازواج نے بھی، حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ "ما رایت عورة رسول الله قط" یعنی "میں نے ہرگز رسول اللہ کی شرمگاہ کو نہیں دیکھا" یا اسی سے قریب عبارت۔ (۲) اگرچہ عائشہ یہ بات ذکر کرنے کے بعد بیان

۱۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۵۳، ۵۴ اور ۱۳۲

۲۔ عیاض کی کتاب الشفاء ج۱ ص ۹۵، الشفاء کی شرح میں قاری نے ابن ماجہ و ترمذی کی کتاب شمائل سے نقل کیا، حیات صحابہ ج۲ ص ۶۱۱ (ترمذی کی کتاب شمائل سے نقل کیا)، لسان المیزان ج۲ ص ۹، سیرۃ الحلبیۃ ج۱ ص ۱۳۲

کرتی ہیں کہ زید بن حارثہ نے دروازہ کھٹکھٹایا پیغمبر اکرمؐ عریان حالت میں تھے آپؐ اپنی چادر کو اوپر لیتے ہوئے دروازے کی طرف جانے کے لئے اٹھے، اللہ کی قسم! میں نے اس سے پہلے نہ کبھی ان کو عریان دیکھا اور نہ پھر اس کے بعد، پھر میں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ نے زید کو گلے لگایا اور اسے پیار کیا۔ (۱) (البتہ حضرت عائشہ کی یہ بات بھی دلیل نہیں ہے کہ انھوں نے شرمگاہ کو دیکھا ہو)۔

۵۔ حدیث غار میں آیا ہے کہ ایک شخص غار کی طرف منہ کر کے اپنی شرمگاہ سے کپڑا ہٹا کر پیشاب کرنے لگا، ابوبکرؓ نے کہا یارسولؐ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے، آپؐ نے فرمایا اگر وہ ہمیں دیکھ لیتا تو پھر ہماری طرف برہنہ ہو کر نہ بیٹھتا۔ (۲) یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ دوسروں کے سامنے برہنہ ہونے والی بات کو مشرکین بھی بہت برا سمجھتے تھے اور وہ کسی کے سامنے برہنہ نہیں ہوتے تھے پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسولؐ نے یہ کام کیا ہو۔

۶۔ ابن عباس ذکر کرتے ہیں کہ رسول خداؐ حجروں میں غسل کرتے تھے اور قطعاً کسی نے بھی آپؐ کی شرمگاہ کو نہیں دیکھا۔ (۳)

۷۔ رسول اللہ کی خصوصیات میں یہ چیز شمار کی گئی ہے کہ کسی نے بھی ان کی شرمگاہ کو نہیں دیکھا، اگر کوئی دیکھ لیتا تو اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتیں۔ (۴)

۱۔ حیات صحابہ کی ج ۲ ص ۵۴۴ و ۵۴۵ پر ترمذی سے نقل کیا گیا کہ (شمائل ج ۲، ص ۹۷) اس نے کہا ہے یہ بات اچھی ہے لیکن بعید ہے۔

۲۔ فتح الباری ج ۷ ص ۱۰، سیرۃ حلبیۃ ج ۲ ص ۳۷ اور بحارالانوار کی ج ۱۹ ص ۷۸ پر ابن شہر آشوب کی کتاب المناقب ج ۱ ص ۱۱۱ سے نقل کیا گیا ہے۔

۳۔ الغدیر ج ۹ ص ۲۸۸ کہ اس نے زرقانی کی شرح المواہب کی ج ۴ ص ۲۸۴ اور فتح الباری کی ج ٦ ص ۳۵۰ سے نقل کیا ہے۔

۴۔ قاضی عیاض کی کتاب الشفاء ج۱ ص ۹۵ اور تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۱۴

پس عباسؓ کی آنکھیں کیوں اندھی نہ ہوئیں؟ جبکہ اس نے دیکھا اور آنحضرتؐ کا تہبند باندھا۔ اسی طرح کعبہ کی مرمت کے وقت موجود دیکھنے والے دوسرے لوگوں کی آنکھیں کیوں اندھی نہ ہوئیں۔ اسی طرح آپؐ کے دوستوں کی آنکھیں اندھی کیوں نہ ہوئیں جب انھوں نے کھیل کے دوران آپؐ کو عریان دیکھا تھا اگر انھوں نے آپؐ کی شرمگاہ کو دیکھا ہوتا تو وہ ضرور اندھے ہو جاتے اور اگر انھوں نے نہیں دیکھا تو پس یہ ماجرا جھوٹ اور افتراء پر مبنی ہے اور حضور اکرمؐ کی شان اقدس میں گستاخی اور بے ادبی ہے یہ ایک ایسی بات ہے جو آپؐ کی عظمت، اعلیٰ منزلت، بلند مرتبے اور اونچی شان کے منافی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی آپؐ کی محافظت اور نگہبانی سے ناسازگار ہے۔ ہم پستی و گمراہی اور شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

ہائے میرے کپڑے!

گذشتہ بات کی مناسبت سے یہ عرض کرتے چلیں کہ ایسی ناروا اور بیہودہ باتیں خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰؑ سے بھی منسوب کی گئی ہیں لیکن وہ اس سے زیادہ بری اور قبیح ہیں۔

بخاری اور دوسروں نے یہ روایت کی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ پر یہ تہمت لگائی کہ ان کے خصیوں میں ہرنیا کی بیماری کی وجہ سے ہوا بھر گئی ہے، حضرت موسیٰؑ نے اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھے اور غسل کرنے لگ گئے۔ جب آپؑ نے اپنے کپڑے اٹھانا چاہے تو پتھر کپڑوں سمیت بھاگ کھڑا ہوا، حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا اٹھایا اور پتھر کا پیچھا کرنے لگے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ اے پتھر میرے کپڑے! اے پتھر میرے کپڑے! یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے ان کے بدن کو دیکھ لیا اور دیکھ کر کہنے لگے خدا کی قسم موسیٰؑ میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اپنے کپڑے اٹھا کر پہن لئے اور اپنے عصا سے پتھر کو مارنے لگ گئے۔ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم پتھر پر تین یا چار یا پانچ زخموں کے نشان تھے۔ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"ولاتکونوا کالذین آذوا موسی، فبراہ اللہ مما قالوا، و کان عند اللہ وجیھاً ..." (۱) یعنی "تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جنھوں نے حضرت موسیٰ کو اذیت و آزار پہنچائی، جو کچھ انھوں نے ان کے بارے میں کہا تھا اس سے ان کو اللہ تعالیٰ نے بری قرار دیا اور وہ اللہ کے نزدیک محترم تھے"۔

لیکن ہمیں سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت موسیٰ کیسے اپنی عریانی کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان پہنچ گئے؟ کس چیز نے ان کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ اپنی عادت اور حیا سے خارج ہوگئے (نعوذ باللہ)؟ وہ حیا اور عفت کہاں گئی جسے روایت یوں بیان کرتی ہے۔ "حضرت موسیٰ شرم و حیا کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے ان کے اسی حیا کی وجہ سے کسی نے ان کے بدن کا کوئی حصہ بھی نہیں دیکھا تھا"۔

اسی طرح ہم اس حیرت انگیز پتھر کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکے کہ جو حضرت موسیٰ کے کپڑے لے کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اس کے پیچھے بھاگتے ہیں؟

یہاں پر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ پتھر تک پہنچنے سے پہلے اپنے عصا کی طرف کیوں متوجہ ہوگئے اور اس وقت ان کے ذہن میں کیا آیا؟

۱۔ البخاری طبع ۱۳۰۹ ج ۱ ص ۴۰ اور ج ۲ ص ۱۵۸، مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۵ الدر المنثور ج ۵ ص ۲۲۳ اس میں مسند احمد، عبدالرزاق احمد، عبد بن حمید، الترمذی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابن الانباری نے مصاحف میں، البزار اور الحاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، ابن ابی شیبۃ نے ابوہریرہ، انس اور ابن عباس سے نقل کیا ہے نیز تفسیر المیزان ج ۱٦ ص ۳۵۳ تفسیر القمی ج ۲ ص ۱۹ جسکی سند حسن ہے لیکن تفسیر کی نسبت قمی کی طرف دنیا مشکوک ہے، مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۱، تفسیر نور الثقلین ج ۴ ص ۳۰۹ اور تفسیر البرہان ج ۳ ص ۳۳۹

اور پتھر اس کام پر مامور نہیں تھا تو کس چیز نے اسے اس عمل پر مجبور کیا اور وہ اپنی طبیعی حالت سے خارج ہوگیا (اور معجزہ نمائی کرنے لگا) لیکن اگر پتھر اس کام پر مامور تھا تو پھر پتھر کی کپڑوں سمیت حرکت کو حضرت موسیٰؑ کیوں جان نہ سکے کہ یہ ایک خارق العادۃ امر ہے؟ جبکہ وہ پتھر کو آوازیں دیتے رہے اور اسے بلاتے رہے جیسے وہ انکی بات سمجھ رہا ہو۔

آخر میں ہمیں اس بات کی بھی سمجھ نہیں آئی کہ اس پتھر کا گناہ کیا تھا کہ اسے اتنی زبردست مار کھانا پڑی جس کی وجہ سے اس پر زخموں کے نشانات بن گئے اور ابوہریرہ نے زخموں کی تعداد کو معین کیوں نہیں کیا اور انہیں شک و تردد کے طور پر بیان کیا اور کہا کہ وہ تین تھے یا چار یا پانچ؟! اور بعض روایات میں تو چھ اور سات تک کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اور جب ابوہریرہ کا نسیان اس حد تک تھا تو اس دقیق واقعے کی دیگر تفصیلات کو کسطرح اس نے حفظ کرلیا تھا؟ نیز اس نے کسطرح رسول اللہؐ کی ان ہزاروں حدیثوں کو حفظ اور تالیف کیا؟

البتہ مذکورہ اعتراضات میں سے کوئی ایک قمی کی روایت پر وارد نہیں ہوتے جس میں عصا، حضرت موسیٰؑ کی آوازیں لگانے اور پتھر کو مارنے کا ذکر نہیں ہے۔ اور شاید قمی کی روایت بخاری کی روایت کی نسبت حقیقت سے زیادہ نزدیک ہو۔

روایات میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اذیت پہنچانے والی آیت بنی اسرائیل کے اس طعن و تشنیع کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰؑ پر حضرت ہارونؑ کے سلسلے میں کی تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ اکھٹے کسی کی زیارت کے لئے گئے تھے راستے میں حضرت ہارون کی وفات ہوگئی تو حضرت موسیٰؑ نے انہیں دفن کر دیا؛ جب وہ واپس آئے تو بنی اسرائیل نے ان پر ہارون کو قتل کرنے کا الزام لگایا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس الزام سے حضرت موسیٰؑ کو اس طرح بری قرار دیا کہ خود حضرت ہارون کے جسد نے خبر دی کہ مجھے طبیعی موت آئی ہے اور کسی نے مجھے قتل نہیں کیا ہے۔ (۱)

۱۔ فتح الباری ج ۶ ص ۳۱۳؛ ابن مردویہ، الطحاوی اور ابن منیع سے مسند حسن کے

حضرت عثمان کی حیاء

یہاں پر مناسب ہے کہ ہم رسول اللہ کے بارے میں مذکور اور حضرت عثمان کی حیاء کے بارے میں ذکر شدہ اقوال کا آپس میں موازنہ کریں۔ تاریخ اور بعض روایات میں ملتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نبی اکرمؐ کے پاس آئے جبکہ آپؐ کی ران برہنہ تھی، آنحضرتؐ نے اسے نہ چھپایا لیکن جب حضرت عثمان آئے تو آپؐ نے فوراً اپنی ران پر کپڑا ڈالا اور اسے چھپا لیا۔ جب حضرت عائشہ نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا کیا اس شخص سے شرم نہ کی جائے جس سے ملائکہ بھی شرم کرتے ہوں یا اسی مضمون کے قریب الفاظ۔ (۱)

اس بات کو اس تناظر میں دیکھا جائے کہ رسول اللہ خود ہمیشہ اور مسلسل حیا کی تاکید کرتے تھے اور اس پر لوگوں کو تشویق کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم میں حیا نہیں

ساتھ نقل ہوا ہے۔ الدر المنثور ج ۵ ص ۲۲۳ میں مذکورہ افراد اور ابن جریر، ابن المنذر ابن ابی حاتم، حاکم اور مصحح حاکم ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے، مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۲

۱۔ مجمع الزوائد ج ۹ ص ۸۲، البدایۃ و النہایۃ ج ۷ ص ۲۰۲ از طبرانی الکبیر و الاوسط میں، مسند احمد، ابی یعلی، نیز تاریخ جرجان ص ۳۱۶، المصنف ج ۱۱ ص ۲۳۲ و ۲۳۳، حیاۃ الصحابہ ج ۲ ص ۶۱۱ و ۶۱۲ کہ مجمع الزوائد اور البدایۃ و النہایۃ سے نقل کرتا ہے، نیز مشکل الآثار ج ۲ ص ۲۸۳ و ۲۸۴، مسند احمد ج ۱ ص ۷۱ اور ج ۶ ص ۶۲، ۱۵۵ و ۱۶۷، صحیح المسلم ج ۷ ص ۱۱۶ و ۱۱۷، الغدیر ج ۹ ص ۲۷۴، ۲۷۵ و ۲۸۷ جو صحیح مسلم، مسند احمد اور مصابیح ج ۲ ص ۲۷۴ سے نقل کرتا ہے، الریاض النضرۃ ج ۲ ص ۸۸ اور دیگر کتب کی طرف رجوع کریں۔

ہے تو پھر جو مرضی آئے کرو؛ حیا ایمان کا جزء ہے اور ایمان کا ٹھکانہ بہشت ہے وغیرہ اسی طرح کی روایات بہت زیادہ ہیں جو آنحضرتؐ سے نقل ہوئی ہیں۔ یہاں پر ان سب کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

علاوہ ازیں ابو سعید خدری پیغمبر اکرمؐ کی یوں توصیف کرتا ہے: "آنحضرتؐ کی حیا با پردہ لڑکیوں کے حیا سے کہیں زیادہ ہے"۔ (۱)

نیز یہی افراد نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے ایک شخص سے فرمایا: اپنی ران کو چھپاؤ کیونکہ یہ بھی شرمگاہ میں شمار ہوتی ہے۔ (۲)

وہ روایات جو دلالت کرتی ہیں کہ ناف اور زانو کے درمیان کا حصہ شرمگاہ ہے، کی تعداد کثیر ہے۔ کتاب الغدیر میں اس سلسلے میں بعض علماء کے اقوال کو ذکر کیا گیا ہے رجوع کریں:

۱۔ البدایة و النہایة ج ٦ ص ٣٦، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۷ جو طبرانی سے دو سند کے ذریعے سے نقل کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک کی سند صحیح والی ہے، صحیح مسلم ج ۷ ص ۸۷، الغدیر ج ۹ ص ۲۸۱ (بخاری کے باب صفة النبی اور مسلم سے ماخوذ)، حیاة الصحابہ (مندرجہ بالا مدارک اور ترمذی ص ۲٦ سے منقول)۔

۲۔ مسند احمد ج ۵ ص ۲۹۰ اور ج ۱ ص ۲۷۵، صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱، سنن بیہقی ج ۲ ص ۲۲۸، الاصابة ج ۳ ص ۴۳۸، فتح الباری ج ۱ ص ۳۰۳، نیل الاوطار ج ۲ ص ۵۰، مستدرک الحاکم ج ۴ ص ۱۸۰ و ۱۸۱، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۵۲ کہ احمد اور طبرانی کی کبیر سے نقل کرتے ہیں، الغدیر ج ۹ ص ۲۸۲ مندرجہ بالا مدارک اور ارشاد الساری سے نقل کرتے ہیں، ابن حبان اپنی صحیح میں، اسی طرح موطا مالک، ترمذی، ابوداود اور مشکل الآثار ج ۲ ص ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸٦ اور ۲۹۳ کی طرف رجوع کریں۔

ج ۹ ص ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۱ و ۲۹۴ اور حیات صحابہ ج ۲ ص ۶۱۲ و ۶۱۳۔

ابو موسیٰ اور حضرت ابوبکر اور ان دونوں کے علاوہ دوسروں کے حیاء کے بارے میں بھی کافی کچھ کہا گیا ہے جن کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

علامہ امینی نے فرمایا ہے کہ اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ رانوں کے ظاہر کرنے کی ممنوعیت سے مراد کراہت ہو نہ حرمت، لیکن اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان کو چھپانا آداب شریعت میں داخل ہے اور یہ عزت و وقار اور عظمت کے لوازم میں سے ہے اور جس کے ادب کا خود رسول اللہ نے حکم دیا ہے اس کی رعایت سب سے زیادہ خود ان کو کرنی چاہیئے ..... ۔ (۱)

اہل کتاب اور انبیاء کی برہنگی

اس بحث کے خاتمہ پر یہ کہنا ضروری ہے کہ اس موضوع کی جڑیں ہمیں اہل کتاب کے ہاں ملتی ہیں اور شاید بنی امیہ نے اس پلید اور خبیث منصوبے کو اہل کتاب سے لیا ہو۔

"اشعیا" کے حالات کی بیسویں فصل کے آخر میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اشعیا سے فرمایا: تین سال تک لوگوں کے درمیان عریان اور پا برہنہ چلو تاکہ اس طرح چل کر لوگوں کو بتاؤ کہ سلطان آشور، مصر کے قیدیوں کو یوں چلنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ جوانوں اور بوڑھوں کو عریان اور پا برہنہ کر دیتا تھا تاکہ اہل مصر کو ذلیل و خوار کرے۔

سفر تکوین کی نویں فصل کے ۲۱ ویں بند میں مذکور ہے کہ "حضرت نوح شراب پی کر مست ہوگئے اور برہنہ حالت میں اپنے باغیچے میں ٹہلنے لگے"۔

صموئیل اول کے بارے میں انیسویں فصل کے بند نمبر ۲۳ اور ۲۴ میں یوں بیان ہوا ہے: "وہ جایا کرتا تھا اور نبوت کا دعویٰ کیا کرتا تھا یہاں تک کہ نایوت الرامہ کے مقام پر آگیا۔

۱۔ الغدیر ج ۹ ص ۲۸۹

اس نے بھی اپنا لباس اتار دیا اور صمویل کے سامنے نبوت کا دعوی کیا۔ اس نے سارا دن اور ساری رات برہنہ حالت میں گزاری۔ اسی لئے کہا گیا کہ اشاول کا شمار بھی انبیاء میں سے تھا"۔

ولادت فاطمہ بنت رسول اللہ

بعض افراد کا کہنا ہے کہ حضرت رسول اکرم کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کی ولادت بعثت سے قبل ہوئی تھی البتہ پھر انہی افراد میں ولادت کے سال کی تعیین میں اختلاف پایا جاتا ہے انہی میں کچھ کا یہ قول ہے کہ ان کی ولادت خانہ کعبہ کی تعمیر نو والے سال میں ہوئی یعنی بعثت سے ۵ سال پہلے۔ (۱)

بعض کہتے ہیں وہ ۷ سال قبل از بعثت میں پیدا ہوئیں (۲) اور ایک قول کے مطابق بعثت سے ۱۲ سال قبل ان کی ولادت ہوئی۔ (۳)

وہ افراد جو ان کی پیدائش کو بعد از بعثت سمجھتے ہیں ان میں بھی اختلاف موجود ہے کچھ افراد سال بعثت میں ہی ان کی ولادت کے قائل ہیں (۴) جبکہ بعض دوسرے افراد نے

۱۔ تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۷۷، ذخائر العقبی ص ۵۲، مقاتل الطالبیین ص ۴۸، سیرۃ مغلطای ص ۱۷ از ابن الجوزی

۲۔ تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۸۷ اور ذخائر العقبی ص ۵۲

۳۔ مندرجہ بالا دو مدارک

۴۔ تاریخ الخمیس ج۱ ص ۲۷۷، ذخائر العقبی ص ۵۲، المواہب اللدنیۃ ج۱ ص ۱۹۸ الاستیعاب حاشیہ الاصابۃ ج۴ ص ۳۷۳، حاکم نے مستدرک کے ج۳ ص ۱۶۱ میں اسی قول کو اختیار کیا اور ذہبی نے سکوت اختیار کیا ہے وہ ص ۱۶۳ پر کہتا ہے کہ فاطمہ کی عمر وفات کے وقت ۲۱ سال تھی اور جب آنحضرت (ص)

بعثت کے دوسرے سال میں پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

صحیح نظریہ

اس بارے میں درست نظریہ شیعیان اہلبیتؑ کا ہے جسے انہوں نے اپنے آئمہؑ سے لیا ہے۔ چونکہ اہلبیتؑ اپنے امور میں دوسروں سے زیادہ آگاہ اور عالم ہیں۔ البتہ غیر شیعوں میں سے بھی کچھ افراد اسی نظریئے کے قائل ہیں اور وہ نظریہ یہ ہے کہ وہ بعثت کے پانچویں سال پیدا ہوئیں اور ۱۸ سال کی عمر میں وفات پاگئیں۔ (۲)

مندرجہ ذیل نکات اسی نظریہ پر دلالت کرتے ہیں یا اس کی تائید کرتے ہیں:

۱۔ اولاد خدیجہؑ کے متعلق گذشتہ بحث میں بعض افراد کا یہ نظریہ کہ عبد مناف کے

کی عمر ۴۱ سال تھی تو وہ پیدا ہوئیں، سیرۃ مغلطای ص ۱۷، بحار الانوار ج ۴۳ ص ۸ اور مرعشی کی ملحقات احقاق الحق ج۱۰ ص ۱۱ جس نے سیوطی کی الثغور الباسمۃ سے نقل کیا ہے۔

۱۔ بحار الانوار ج ۴۳ ص ۸ از اقبال الاعمال جس نے شیخ مفید کی حدائق الریاض سے نقل کیا ہے۔

۲۔ ذخائر العقبی ص ۵۲، تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۷۸ کہ وہ امام ابوبکر، احمد بن نصر بن عبد اللہ الدراع سے کتاب موالید اہلبیت سے نقل کرتا ہے، بحار الانوار ج ۴۳ ص ۱۰-۹، اس میں کافی سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، المصباح الکبیر، دلائل الامامۃ، مصباح الکفعمی، الروضۃ، مناقب ابن شہر آشوب، ان دو آخری کتابوں میں آیا ہے کہ حضرت فاطمہ (س) کی ولادت بعثت کے پانچ سال بعد اور واقعہ معراج کے تین سال بعد ہوئی۔ اسی طرح کشف الغمۃ اور اثبات الوصیۃ مسعودی وغیرہ میں مذکور ہے۔

علاوہ حضرت خدیجہؑ کی باقی سب اولاد بعثت کے بعد پیدا ہوئی۔ (۱) جبکہ ہمیں علم ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا آنحضرتؐ کی اولاد میں سب سے چھوٹی تھیں۔

اس امر پر ایک اور دلیل وہ بات ہے جو "الاستیعاب" میں حضرت خدیجہؑ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت طیب نبوت کے بعد دنیا میں آئے پھر ام کلثوم اور ان کے بعد حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا۔

۲۔ حضرت فاطمہ زہرا (س) کی بعثت کے بعد پیدا ہونے کی دلیل وہ متعدد روایات ہیں جو کافی سارے علماء سے مختلف انداز اور گوناگوں طریقوں سے نقل ہوئی ہیں۔ روایات کی یہ کثیر تعداد دلالت کرتی ہے کہ حضرت فاطمہ (س) کا نطفہ اس پھل سے وجود میں آیا جو جبرئیلؑ رسولؐ اللہ کے لئے بہشت سے لائے تھے۔ یہ بات متعدد صحابہ سے نقل ہوئی ہے جن میں حضرت عائشہ، حضرت عمر بن خطاب، حضرت سعد بن مالک اور حضرت ابن عباس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (۲) ان میں سے اگر بعض روایات میں بحث و تنقید کی گنجائش ہو بھی لیکن بعض روایات میں کسی قسم کے اشکال یا اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۱۔ البدایہ و التاریخ ج ۵ ص ۱۶، المواہب اللدنیۃ ج ۱ ص ۱۹۶ اور تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۷۲

۲۔ ان میں بعض روایات شیعہ کتب میں پائی جاتی ہیں مثال کے طور پر بحار الانوار ج ۴۳ ص ۴، ۵ اور ۶۔ وہ امالی شیخ صدوق، عیون اخبار الرضا، معانی الاخبار، علل و الشرائع، تفسیر القمی اور الاحتجاج وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔ اسی طرح غیرشیعہ کتب میں بھی ایسی روایات پائی جاتی ہیں مثال کے طور پر تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۲۷۷، ذخائر العقبی ص ۳۶، لسان المیزان ج ۱ ص ۱۳۳، اللالی المصنوعۃ ج ۱ ص ۳۹۲-۳۹۴، ملحقات احقاق الحق ج ۱۰ ص ۱۰-۱، میں نجفی مرعشی سابقہ حوالوں اور میزان الاعتدال سے نقل

اسی طرح نسائیؒ نے جو روایت نقل کی ہے وہ بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ "جب حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے آنحضرتؐ سے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا رشتہ مانگا تو آپؐ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ تو ابھی بچی (نابالغ) ہے۔

آخر میں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ بعثت کے پانچویں سال حضرت خدیجہؑ کا حاملہ ہونا اور حضرت فاطمہؑ کا ان کے بطن میں ہونا بعید ہے کیونکہ اس وقت ان کی عمر کافی زیادہ ہو چکی تھی تو یہ خیال بھی فضول ہے چونکہ گذشتہ ابحاث میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اس وقت حضرت خدیجہؑ کی عمر مختلف اقوال کی بنا پر ۴۵ سال سے ۵۰ سال کے لگ بھگ تھی اور شاید باقی اقوال کے مقابلے میں ان دو میں سے ایک قول قوی تر ہو اگرچہ قول مشہور اس کے خلاف ہو لیکن قول مشہور کے مطابق بھی حضرت خدیجہؑ کی عمر حمل سے مانع نہیں تھی کیونکہ جیساکہ فقہ میں ثابت ہے قریشی خواتین کو ۶۰ سال تک خون حیض آتا رہتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک حضرت خدیجہؑ میں حاملہ ہونے کی صلاحیت موجود تھی جیساکہ ظاہر بھی یہی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اور جو بات مصباح نے کی ہے کہ "اہل سنت روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ولادت بعثت سے ۵ سال قبل ہوئی ہے"۔ (۱) ان دونوں سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ ۲۹ سال کی عمر میں حضرت فاطمہؑ کی وفات کے

کرتے ہیں، الروض الفائق، نزھۃ المجالس، مجمع الزوائد، کنز العمال، منتخب العمال، محاضرۃ الاوائل، مقتل الحسین خوارزمی، تاریخ البغداد، مفتاح النجاۃ، المناقب عبد اللہ شافعی، مستدرک الحاکم، تلخیص مستدرک ذھبی، اعراب ثلاثین سورہ، اخبار الدول اور المناقب ابن مغازلی۔

۱۔ بحار الانوار ج ۴۳ اور مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۰-۱ کی طرف رجوع کریں۔

نظریے کو اہلبیتؑ اور شیعوں کی اکثریت سے نسبت دینے میں مسعودی نے غلطی کی ہے۔ (۱)

شاید یہ اس کے قلم کی غلطی ہو یا اس نے عمداً ایسا کیا ہو یا پھر نسخہ برداری کرنے والوں کی کتابت کی غلطی ہو کہ انھوں نے ۱۹ کی بجائے ۲۹ لکھ دیا ہو۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں اگر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ولادت بعثت کے پانچویں سال میں واقع ہو تو وفات کے وقت ان کی عمر صرف ۱۸ سال بنتی ہے جیساکہ ظاہر ہے۔

۱۔ التنبیہ و الاشراف ص ۲۵۰

تیسری فصل

تذکرہ سیرت سے پہلے کچھ باتیں

پہلی بات

نبی اکرمؐ کے آباء و اجداد (حضرت آدمؑ تک) کا ایمان

کہا گیا ہے کہ امامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ کے آباء و اجداد حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہ تک سب کے سب مومن اور موحد تھے۔ (۱) بلکہ مجلسی اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ کے آباء و اجداد صدیقین میں سے تھے یا وہ انبیاء اور مرسلین میں سے تھے یا پھر ان کے آباء و اجداد معصوم اوصیاء میں سے تھے اور ان میں سے جنھوں نے اسلام کا اظہار نہیں کیا شاید اس کی وجہ تقیہ یا دینی مصلحت تھی۔ (۲)

شیخ صدوق مزید اضافہ کرتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وھب سلام اللہ علیہا بھی مسلمان تھیں"۔ (۳)

۱۔ اوائل المقالات ص ۱۲، تصحیح الاعتقاد ص ۶۷، تفسیر رازی ج ۲۴ ص ۱۷۳ مطبوعة دار الکتب الاسلامیة تہران، ایک اور ایڈیشن کی ج ۴ ص ۱۰۳، بحار الانوار ج ۱۵ ص ۱۱۷، مجمع البیان ج ۴ ص ۳۲۲ اور البدایة و النہایة ج ۲ ص ۲۸۱ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۔ بحار الانوار ج ۱۵ ص ۱۱۷

۳۔ ایضاً

لیکن غیر شیعہ حضرات کی اکثریت پیغمبرؐ کے والدین کے کفر کا نظریہ رکھتی ہے! کچھ لوگ ان کے ایمان کے بھی قائل ہیں جن لوگوں نے حضرت عبدالمطلبؑ اور آنحضرتؐ کے دیگر اجداد کے با ایمان ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے ان میں درج ذیل افراد قابل ذکر ہیں۔ مسعودی، یعقوبی، ماوردی (جیساکہ اس کے کلام سے ظاہر ہے)، رازی (اپنی کتاب "اسرار التنزیل" میں)، السنوسی اور شفاء کے حاشیہ میں تلمسانی اور سیوطی۔ اس مطلب کے اثبات کیلئے آخری دور میں متعدد رسالے اور مقالات تحریر کئے گئے ہیں مثال کے طور پر:

۱) مسالک الحنفاء

۲) الدرج الحنیفہ فی الاباء الشریفة

۳) المقامة السندسیة فی النسبة المصطفویة

۴) التعظیم و المنة فی ان ابوی رسول اللّٰہ (ص) فی الجنة

۵) السبل الجلیة فی الاباء العلیه

٦) نشر العلمین المنیفین فی اثبات عدم وضع حدیث احیاء ابویه و اسلامهما علی یدیه ...

اس کے مقابلے میں بعض افراد نے آنحضرتؐ کے آباء و اجداد کے کفر کو ثابت کرنے کے لئے کتابچے لکھے ہیں مثال کے طور پر ابراہیم حلبی اور علی قاری جس نے شرح الفقہ الاکبر میں تفصیلاً اس مسئلے پر گفتگو کی ہے اور سیوطی پر سہل انگاری کا الزام لگاتے ہوئے کہا ہے کہ اگر اس کی بات فقاو پیشواؤں کے مطابق نہ ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اس موضوع پر بعض دلیلیں

امامیہ کہتے ہیں کہ مذہب حقہ کے اجماع کے علاوہ، روایات کی بہت بڑی تعداد آنحضرتؐ کے آباء و اجداد کے مومن ہونے پر دلالت کرتی ہے اور چونکہ اجماع کا ماخذ اور سرچشمہ معلوم ہے لہذا ہم اس کے مآخذ پر بحث کرتے ہیں، اجماع کا مآخذ روایات ہیں۔ البتہ ان

تمام روایات کا احاطہ کرنا اگر غیر ممکن نہ ہو تو مشکل ضرور ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار کی پندرہویں جلد میں ان میں سے بعض روایات کا ذکر کیا ہے اور سیوطی نے بھی مذکورہ رسالوں میں بعض کا تذکرہ کیا ہے۔

اس مطلب کے اثبات کے لئے جن دلائل کو پیش کیا گیا ہے ان میں ایک آنحضرتؐ کی یہ حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "لم یزل ینقلنی اللّٰہ من اصلاب الطاھرین الی ارحام المطھرات، حتی اخرجنی فی عالمکم، و لم یدنسی بدنس الجاھلیة". (۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے مسلسل پاکیزہ صلبوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل کیا یہاں تک کہ مجھے تمہاری دنیا میں پیدا کیا اور مجھے ہرگز جاہلیت کی پلیدی سے آلودہ نہ کیا۔

بدیہی ہے کہ اگر آنحضرتؐ کے آباء و اجداد کافر ہوتے تو ان سب کی پاکیزگی کے ساتھ توصیف نہ کی جاتی کیونکہ ارشاد خداوندی ہے: "انما المشرکون نجس". (۲)

آنحضرتؐ کے اجداد کے مومن ہونے پر دوسری دلیل قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "الذی یراک حین تقوم و تقلبک فی الساجدین". (۳)

ابن عباس، ابو جعفر اور ابو عبداللہ علیہما السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "آنحضرتؐ مسلسل ایک نبی کی صلب سے دوسرے نبی کی صلب میں منتقل ہوتے رہے"۔

اس استدلال پر مناقشہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عبادت اور سجدے کی حالت میں دیکھتا ہے نہ یہ کہ انبیاء کی

۱۔ مجمع البیان ج ۴ ص ۳۲۲، بحار الانوار ج ۱۵ ص ۱۱۸-۱۱۷، تفسیر رازی ج ۲۴ ص ۱۷۴، سیرة الحلبیة ج ۱ ص ۳۰، الدر المنثور ج ۵ ص ۹۸، سیرة دحلان ج ۱ ص ۱۸ اور تصحیح الاعتقاد ص ۶۷

۲۔ سورہ توبہ، آیت ۲۹

۳۔ سورہ شعراء، آیت ۲۱۸ و ۲۱۹

اصلاب میں منتقل ہوتے ہوئے اور اگر روایت ثابت بھی ہو جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ حضور اکرمؐ کے تمام آباء و اجداد کے ایسا ہونے پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جس طرح اللہ تعالٰی انہیں انبیاء کی صلبوں میں منتقل ہوتے دیکھتا ہے اسی طرح انہیں غیر انبیاء کی اصلاب میں بھی منتقل ہوتے ہوئے مشاہدہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ کے تمام آباء و اجداد کی نبوت کو ثابت کرنا واقعاً مشکل ہے۔

رہی اس نظریے کے حامل اہل سنت کی دلیلوں کی بات تو سیوطی نے اپنے رسائل میں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تمام دلائل پر مکمل طور پر بحث و گفتگو کی ہے البتہ ان میں موجود ضعیف اور قوی نکات کو بیان کرنے کیلئے کافی وقت اور جداگانہ تالیف کی ضرورت ہے۔

حضرت ابراہیمؑ تک حضور کے آباء و اجداد کے ایمان پر اس آیت سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: "و جعلها كلمة باقية فی عقبه". (۱)

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ کلمۃ اللہ کا ابراہیمؑ کی ذریت اور نسل میں باقی رہنا ضروری امر ہے اور ان کی نسل میں ہمیشہ ایسے افراد کا وجود ضروری ہے جو قیامت تک اپنی فطرت پر اللہ تعالٰی کی عبادت کرتے رہیں اور شاید حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی قبولیت کا یہی معنی ہو۔ انہوں نے اپنے پروردگار سے یہ دعا کی کہ: "و اجنبنی و بنی ان نعبد الاصنام". (۲) یعنی مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کی پرستش سے بچا۔

اور فرمایا: "رب اجعلنی مقیم الصلاة و من ذریتی". (۳) یعنی اے میرے پروردگار! مجھے اور میری ذریت کو نماز قائم کرنے والے قرار دے۔

واضح رہے کہ اگر اللہ تعالٰی حضرت ابراہیمؑ کی تمام اولاد کے متعلق ان کی دعا کو قبول

۱۔ سورہ زخرف، آیت ۲۸

۲۔ سورہ ابراہیم، آیت ۳۵

۳۔ سورہ ابراہیم، آیت ۴۰

کرتا تو ابو لہب سب سے بڑے مشرکوں اور رسول اللہ کے سخت ترین دشمنوں میں سے نہ ہوتا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آیت میں "من ذریتی" میں ذکر شدہ "من" تبعیض کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی اس سے مراد بعض ہیں نہ کہ سب۔

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے مغفرت طلب کرنا

رسالتمآبؐ کے تمام آباء و اجداد کے ایمان کے قائلین پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ آزر کے کفر کو صراحت کے ساتھ اس آیت میں بیان کیا ہے: "و ما کان استغفار ابراهیم لابیه الا عن موعدة وعدها ایاه، فلما تبین له انه عدو لله تبرا منه، ان ابراهیم لاواه حلیم"۔ (۱) یعنی اور ابراہیم کا اپنے باپ (آزر) کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے باپ سے کر لیا تھا پھر جب انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے بیشک ابراہیمؑ یقیناً بڑے دردمند اور بردبار تھے۔

اس اعتراض کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن حجر کے دعوے کے مطابق تمام مؤرخین کا اجماع ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کے باپ نہیں تھے بلکہ وہ ان کے چچا تھے یا نانا تھے اختلاف نقل کی بنا پر (۲) اور اس پر "اب" یعنی باپ کے لفظ کا اطلاق کرنا مجازی طور پر ہے جیساکہ قرآن ارشاد فرماتا ہے: "ام کنتم شهداء اذ حضر یعقوب الموت؛ اذ قال لبنیه ما تعبدون من بعدی، قالوا نعبد الهک و اله آبائک ابراهیم و اسماعیل و اسحاق"۔ (۳) یعنی اے (یہود) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے

۱۔ سورہ توبہ، آیت ۱۱۴

۲۔ دحلان کی سیرت نبویہ ج ۱ ص ۴۷ کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۳۳

سر موت آ کھڑی ہوئی اس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ کہنے لگے ہم آپ کے معبود اور آپ کے آباء و اجداد ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے۔ اس آیت میں حضرت اسماعیل کو حضرت یعقوب کا باپ کہا گیا ہے جبکہ وہ ان کے چچا تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اس باپ کے لئے زندگی کے ابتدائی دور اور جوانی میں طلب مغفرت کی تھی علاوہ ازیں ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ بڑھاپے کی عمر کو پہنچتے ہیں اور خدا انھیں اولاد کی نعمت سے نوازتا ہے تو اس پیری کے عالم میں وہ اپنے والدین کے لئے مغفرت اور بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"ربنا اغفر لی و لوالدی و للمؤمنین، یوم یقوم الحساب". (۱) یعنی اے میرے پروردگار مجھے، میرے والدین اور مومنین کو حساب کے دن بخش دے۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ درخواست اس وقت کی جب انھیں آخری عمر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام عطا کئے تھے جیساکہ آیات شریفہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ (۲)

تیسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جس باپ کے لئے حضرت ابراہیمؑ مغفرت طلب کرتے ہیں اور پھر اس سے برائت کا اظہار کرتے ہیں وہ بعد میں ایمان لے آیا ہو اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے دوبارہ اس کے لئے بخشش کی دعا کی ہو۔

علامہ محقق سید مہدی روحانی کا یہ نظریہ ہے کہ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کے باپ نہیں تھے بلکہ ان کے باپ کا نام "تارخ" تھا اس اتفاق کا ماخذ تورات ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اسے یوں ذکر کرتے ہیں کہ

۱۔ سورہ ابراہیم، آیت ۴۱

۲۔ تفسیر المیزان ج ۱۲ ص ۷۸ و ۷۹ کی طرف رجوع کریں

ممکن ہے حضرت ابراہیمؑ کے والد مشرک ہوں اور باپ بیٹے کے درمیان ایمان پر بحث ہوئی ہو اور حضرت ابراہیمؑ نے اس سے استغفار کا وعدہ کیا ہو اور پھر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وعدے کو پورا کیا ہو۔ پھر ان کے باپ ایمان لے آئے ہوں اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دوبارہ ان کے لئے بخشش کی دعا کی ہو۔ البتہ آخری عمر میں جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور یہ احتمال زیادہ قوی ہے اور ضروری نہیں کہ ہم قرآن میں ذکر ہونے والے لفظ "اب" یعنی والد سے مراد مجازی باپ (چچا) لیں۔

میرا اور تمہارا باپ جہنم میں ہیں

مسلم اور دوسروں نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے پوچھا کہ میرا باپ کہاں ہے؟ آپؐ نے فرمایا: دوزخ میں۔ جب وہ شخص پیچھے مڑ کر جانے لگا تو آپؐ نے اسے بلایا اور فرمایا میرا باپ اور تمہارا باپ دونوں دوزخ میں ہیں۔ (۱) یہ روایت چند دلائل کی بنا پر درست نہیں ہے۔

اولاً: گذشتہ باتوں کی بنا پر جو حضورؐ کے تمام آباء و اجداد کے ایمان کو ثابت کرتی ہے۔

ثانیاً: مذکورہ روایت کو حماد بن سلمہ، ثابت سے اور وہ انس سے نقل کرتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں معمر اسی حدیث کو ثابت اور وہ انس سے روایت نقل کرتا ہے لیکن کسی اور شکل میں جو آنحضرتؐ کے باپ کے کفر پر دلالت نہیں کرتی۔ وہ نقل کرتا ہے کہ آپؐ نے

۱۔ صحیح مسلم کے علاوہ صفۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۷۲ (از مسلم) کی طرف رجوع کریں اسی طرح الاصابۃ ج ۱ ص ۳۳۷ جس نے ابن خزیمۃ سے نقل کیا ہے، سنن ابی داؤد ج ۱۲ ص ۴۹۴، البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۸۰ اور مسالک الحنفاء ص ۵۵-۵۴ نے بھی مسلم سے نقل کیا ہے۔

اس شخص سے فرمایا: "جب بھی تم کسی کافر کی قبر سے گزرو تو اسے جہنم کی نوید سناؤ"۔ (۱)

اس حدیث کے راویوں کے ہم نظریہ علماء رجال نے وضاحت کی ہے کہ معمر، حماد سے زیادہ ثقہ ہے۔ لوگوں نے حماد کی حافظے پر باتیں کی ہیں یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ اس کا حافظہ کم تھا۔ اس کی حدیث کی کتابوں میں ربیعہ نے بہت سی غلط باتیں داخل کی ہیں کہ حماد کا حافظہ اچھا نہ تھا وہ ان احادیث کو بیان کرتا تھا اور اسے کتاب کا حصہ سمجھتا تھا۔ (۲)

ثالثاً: یہ روایت صحیح سند کے ساتھ البتہ شیخین (مسلم اور بخاری) کی شرط کے مطابق سعد بن ابی وقاص سے نقل ہوئی ہے اس میں آیا ہے کہ "جب کافر کی قبر سے عبور کرو تو اسے دوزخ کی خبر سناؤ"۔ (۳) اسی طرح یہ حدیث اسی مضمون کے ساتھ صحیح سند کے ساتھ زہری سے بھی نقل ہوئی ہے۔ (۴)

قابل توجہ نکتہ

گزشتہ حدیث میں رسول اللہ کے الفاظ کو ملاحظہ فرمائیں کہ آپ فرماتے ہیں کہ "جب کسی کافر کی قبر سے تمہارا گزر ہو تو اسے آگ کی بشارت دو"۔ یہاں لطیف طریقے پر

۱۔ سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۵۱-۵۰، مسالک الحنفاء ص ۵۵-۵۴

۲۔ سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۵۱، مقدمہ فتح الباری ص ۳۹۷، تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۵-۱۲ اور مسالک الحنفاء ص ۵۵

۳۔ سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۵۱ ابزار، طبرانی اور بیہقی سے نقل کیا ہے، البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۸۰ نے اسے بیہقی سے نقل کیا ہے۔ مسالک الحنفاء ص ۵۵ پر سابقہ افراد سے اور ص ۵۶ پر ابن ماجہ سے نقل ہوا ہے۔

۴۔ حافظ عبد الرزاق کی مصنف ج ۱۰ ص ۴۵۴

توریہ سے کام لیا گیا ہے جس سے سائل کی دلجوئی بھی کی گئی ہے اور حقیقت میں یہ بات سچی بھی ہے اور کسی لحاظ سے بھی حضور اکرمؐ کے والد کے کفر پر دلالت نہیں کرتی۔ کیونکہ کافر کو جہنم کی بشارت دینا ایک طبیعی امر ہے لیکن یہ بات کہ آپؐ کے والد کافر تھے یا نہ، مذکورہ الفاظ سے یہ مطلب اخذ نہیں ہوتا۔

عجیب بات یہ ہے کہ آنحضرتؐ سے آپؐ کی والدہ ماجدہ کے بارے میں بھی اسی روایت سے مشابہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپؐ نے دو اشخاص سے فرمایا: "میری اور تمہاری مائیں دوزخ میں ہیں"۔

اس بارے میں ہم خود کچھ نہیں کہتے جو کچھ ذہبی نے کہا ہے اس کی تائید کرتے ہیں، ذہبی اس حدیث یعنی "میری اور تمہاری مائیں آتش جہنم میں ہیں" کے باطل ہونے کی قسم کھاتا ہے۔ (۱)

رابعاً: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپؐ کے والدین، حضرت ابوطالبؑ، حضرت عبدالمطلبؑ اور دوسرے اجداد دوزخ میں ہوں جیساکہ بعض لوگوں کا اصرار ہے لیکن ورقہ بن نوفل جو آپکی بعثت کے وقت موجود تھا اور آپؐ پر ایمان نہیں لایا تھا وہ ریشمی لباس زیب تن کئے جنت کی سیر کررہا ہو (۲) اسی طرح عمر بن خطاب کا چچازاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ جنت میں گشت کررہا ہو (۳) اور یہی حال امیہ بن ابی الصلت کا ہو جو صرف اپنے شعر کی بدولت قریب تھا کہ مسلمان ہوجائے (۴) اور اسی طرح دیگر افراد۔ (۵)

۱۔ سیرۃ حلبیۃ ج ۱ ص ۱۰۶ اور مسالک الحنفاء ص ۵۲

۲۔ آئندہ ہم آغاز وحی کے بارے میں بعض روایات کے حوالے سے ورقہ کے حالات کا جائزہ لیں گے۔

۳۔ دحلان کی سیرت نبویہ ج ۱ ص ۳۹ اور ۱۶۸، البدایۃ و النہایۃ ج ۲ ص ۲۳۱-۲۳۷

۴۔ امیہ نے اپنے شعر میں ایک جملہ کہا ہے گویا اس سے اس کا مسلمان ہونا ظاہر

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان ان متعدد اور متواتر احادیث اور تواریخ کو نظر انداز کر دے جو سب ان کے ایمان پر دلالت کرتی ہیں لیکن چند اور لوگوں کے ایمان کو کسی شعر یا فضول قسم کے الفاظ کے ذریعے تسلیم کرے جو کسی بھی صورت میں انسان کے سابقہ ارادے میں اثر نہیں کرتے۔

ہاں! وہ کیسے نجات نہ پائیں اور آگ میں کیونکر جلیں (۱) جبکہ عہد جاہلیت کے مشرکین بہشت میں جائیں؟ حلبی بیان کرتا ہے کہ فترت کے زمانے (دو پیغمبروں کے درمیان وقفے) میں زندگی گزارنے والے لوگوں کو کوئی عذاب نہیں ہوگا مگر ایک ضعیف قول کے مطابق جو اس نظریے پر مبنی ہے کہ ایمان اور توحید عقلی وجوب رکھتے ہیں لیکن اہل سنت و الجماعت کی اکثریت کا یہ نظریہ نہیں ہے ان کے عقیدے کے مطابق توحید پر ایمان واجب نہیں ہے مگر رسولوں کے بھیجنے کے بعد۔

اشاعرہ کا اصول میں اور شافعیوں کا فقہ میں اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور دعوت اس تک نہ پہنچی ہو تو وہ دوزخ سے نجات پائے گا اور بہشت میں داخل ہوگا اس بنا پر دوران فترت کے عربوں پر عذاب نہیں ہوگا ہرچند وہ بت پرستی کرتے رہے ہوں یا اپنے دین میں تغیر و تبدل ایجاد کرتے رہے ہوں۔ اور جو احادیث ان کے عذاب کے مورد میں آئی ہیں ان کی تاویل کی جائے۔ (۲)

ہوتے ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان باتوں سے کسی کے اسلام کو ثابت نہیں کیا ... ان کا بہشت میں داخل ہونا ثابت کیا جائے۔ (مترجم)

... حلبیۃ ج ۱ ص ... ۱۰۶۔۱۰۵ ...

... ۲۶۴، ۲۹۵ ... سے نقل کیا ہے، سیرۃ حلبیۃ

اس گفتگو اور ان متواتر احادیث سے یہ بات مردود ٹھہرتی ہے کہ آنحضرتؐ کو اپنی والدہ ماجدہؑ کے لئے مغفرت طلب کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اگرچہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اہل فترت کے پاس عقلی یا نقلی حجت موجود تھی اس کے باوجود بھی انھوں نے بت پرستی کی ہے تو وہ ضرور عذاب میں مبتلا ہوں گے مگر یہ کہ وہ جاہل قاصر ہوں۔ کیونکہ توحید عقل کے ذریعے ثابت ہوتی ہے نہ ارسال رُسل کے ذریعے، ورنہ کوئی بھی چیز قابل اثبات نہیں ہے نہ توحید، نہ نبوت اور نہ دین کی کوئی اساس اور بنیاد۔

عجیب نکتہ

یہاں تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بعض افراد اس روایت کہ "میرا اور تمہارا باپ دوزخ میں ہے" کی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں باپ سے مراد آپؐ کے چچا ابو طالب ہیں کیونکہ عرب چچا کو بھی باپ کہتے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کو ابو طالب کا بیٹا کہا جاتا تھا۔ (۱)

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپؐ کے دوسرے چچا ابو لہب لعنۃ اللہ علیہ جس کا کفر مسلم اور قطعی ہے کو تو چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جو آپؐ کا خیرخواہ، مخلص اور آپؐ کے اور دین کے راستے میں قربانی دیتا ہے نیز آپؐ کی اور دین اسلام کی حفاظت کرتا ہے اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگلی بحثوں میں ذکر ہوگا کہ حضرت ابو طالبؑ کا ایمان مسلم اور ثابت شدہ ہے۔ اس بارے میں ہم جناب عظیم آبادی کی بات پر اکتفا کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "یہ کلام بھی ضعیف اور باطل ہے"۔ (۲)

ج ۱ ص ۱۰۷-۱۰۶، ابن حجر ہیتمی، مناوی اور سیوطی کا بھی یہی نظریہ ہے۔

۱۔ عون المعبود ج ۱۲ ص ۳۹۵-۳۹۴ میں اسے سندی سے نقل کیا ہے، سیرۃ حلبیہ ج ۱ ص ۵۱ اور مسالک الحنفاء ص ۵۸

۲۔ عون المعبود ج ۱۲ ص ۳۹۵

دوسری بات

بعثت سے پہلے پیغمبرؐ کا دین

بعثت سے پہلے نبی اکرمؐ کا خدائے واحد پر ایمان مسلمات میں سے ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ کیا اس زمانے میں آپؐ کسی نبی کی شریعت کی پیروی کرتے تھے یا نہیں؟ شریعت کی پیروی کرنے کی صورت میں کس نبی کی شریعت پر عمل کرتے تھے آیا حضرت نوحؑ یا حضرت ابراہیمؑ یا حضرت عیسیٰؑ کی شریعت پر یا ہر اس چیز پر جو آپؐ کے نزدیک خدا کی طرف سے ہو؟ یا اصلاً کسی شریعت کے پابند نہیں تھے؟ ہر گروہ نے اس بارے میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔

عبدالجبار، غزالی اور سید مرتضیٰ نے اس مسئلے میں توقف اختیار کیا ہے۔ علامہ مجلسی کا نظریہ یہ ہے کہ بعثت سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کی ابتدائی زندگی میں آپ کی عقل کو کامل کیا تو آپؐ اس وقت سے نبی تھے اور روح القدس کے ذریعے آپؐ کی تائید کی گئی، آپؐ فرشتے سے باتیں کرتے تھے اور غیبی آواز کو سنتے تھے، الہام بخش خواب دیکھتے تھے، اس کے ۴۰ سال بعد آپؐ کو رسول بنایا گیا پھر آپؐ نے فرشتے کو دیکھا اور اس سے کلام کیا، آپؐ پر قرآن نازل ہوا اور تبلیغ کا آپؐ کو حکم دیا گیا۔ علامہ مجلسی کہتے ہیں کہ انھوں نے

یہ بات معتبر ذرائع اور اخبار مستفیضہ سے اخذ کی ہے۔ (۱)

آنحضرتؐ کے بچپن سے ہی نبی ہونے کے اثبات کے لئے قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قول سے استدلال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "انی عبد اللّٰه آتانی الکتاب و جعلنی نبیا و جعلنی مبارکا اینما کنت و اوصانی بالصلاۃ و الزکاۃ ما دمت حیا". (۲) یعنی بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے مجھے نبی بنایا اور مجھے برکت والا قرار دیا ہے میں جہاں بھی رہوں اور جب تک زندہ رہوں اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔

حضرت یحییٰ کے بارے میں خدا فرماتا ہے: "و آتیناہ الحکم صبیا". (۳) یعنی ہم نے بچپن میں اسے حکم عطا کیا۔

اگر ہم ان آیات کے ساتھ ان کثیر احادیث کا بھی اضافہ کریں جن میں بعض صحیح بھی ہیں مثال کے طور پر یزید الکناسی سے منقول روایت جو کافی میں ذکر ہوئی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو کوئی فضیلت، کرامت اور معجزہ عطا نہیں کیا مگر یہ کہ وہ ہمارے پیغمبرؐ کو بھی بخشا"۔ تو اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمدؐ کو بچپن سے ہی حکم اور نبوت عطا کر دی تھی۔ (۴) اس کے بعد ۴۰ سال کی عمر میں آپؐ کو تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ علامہ مجلسیؒ نے اس دلیل کو کئی طریقوں اور دلائل کے ساتھ اپنی گراں قدر کتاب بحار الانوار ج ۱۸ ص ۲۷۷ سے ۲۸۱ تک میں واضح کیا ہے۔

البتہ اگرچہ اس جگہ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جو چیز ہم یہاں ثابت کرنا چاہتے

۱۔ بحارالانوار ج ۱۸ ص ۲۷۷

۲۔ سورہ مریم، آیت ۳۰

۳۔ سورہ مریم،آیت ۱۲

۴۔ بحارالانوار ج ۱۸ ص ۲۷۸ و ۲۷۹ کی طرف رجوع کریں۔

ہیں اس کے لئے تمام انبیاء کے فضائل اور معجزات کا عطا ہونا ضروری نہیں تھا کیونکہ آنحضرتؐ کے زمانے میں بعض معجزات کی اصلاً ضرورت ہی نہیں تھی ہاں وہ رسول اکرمؐ کے اختیار میں ضرور تھے اگر ان کی ضرورت پیش آ جاتی تو آپؐ ان سب سے استفادہ کر سکتے تھے لیکن فضائل کے لحاظ سے آپؐ کی ذات والا صفات تمام کمالات اور فضائل کا ایک کامل اور اعلیٰ مجموعہ تھی۔ مثال کے طور پر اگر حضرت ایوبؑ اپنے صبر کے لحاظ سے باقی تمام نبیوں سے ممتاز ہیں تو بے شک ہمارے پیارے نبیؐ کا صبر ان سے کامل تر ہے اسی طرح دیگر فضائل، امتیازات اور مکارم اخلاق کے حوالے سے آپؐ تمام انبیاء سے زیادہ کامل و اکمل ہیں۔

رہے کرامات تو ان سے ظاہری طور پر وہی معجزات مراد ہیں کیونکہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نوازا اور عزت و بزرگی عطا فرمائی۔

ان تمام مطالب سے قطع نظر ان روایات کا ثابت ہونا ان کی دلالت کو قطعی سمجھنے کے بعد نہایت ضروری ہے تاکہ ان کے مضمون کے مطابق فیصلہ کیا جا سکے۔

البتہ ایسی روایات بکثرت ملتی ہیں جو قبل از بعثت آپؐ کی نبوت کو صراحتاً یا اشارتاً بیان کرتی ہیں، علامہ مجلسی نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے جیساکہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

اسی طرح الغدیر (ج۹ ص ۲۸۷) بھی مختلف غیر شیعہ مآخذ کے حوالے سے اس حدیث کی طرف اشارہ کرتی ہے: "انہ کان نبیاً و آدم بین الروح و الجسد"۔ یعنی محمدؐ اس وقت نبی تھے جب آدم روح اور جسم کے درمیان تھے۔

لیکن اس مسئلے کے بارے میں ان روایات کی اسناد اور دلالت میں غور و فکر کرنے اور ان کی دلالت کے قطعی ثبوت کے بعد کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے یا کوئی رائے دی جا سکتی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم گذشتہ نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ قبل از بعثت مومن اور موحد تھے آپؐ خدا کی پرستش کرتے تھے آپؐ کے نزدیک جو کچھ شریعت الٰہی کے عنوان سے ثابت تھا اور جس بات کو آپؐ کی عقل سلیم قبول کرتی تھی اس پر آپؐ کا عقیدہ تھا اور آپؐ اس پر عمل کرتے تھے تائید الٰہی ہمیشہ آپؐ

کے شامل حال تھی اور آپ کی حفاظت اسی کی طرف سے ہوتی تھی آپ خلقت، سیرت اور عقل کے لحاظ سے اس کی تمام مخلوقات سے افضل اور اکمل تھے۔

علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم کی خصوصیات کے بیان میں کہا گیا ہے کہ آپ ان امور کے پابند تھے جن کا علم شریعت کی طرف سے ہو سکتا تھا مثلاً آپ مردار نہیں کھاتے تھے، تسمیہ اور تحمید پڑھتے تھے وغیرہ اس طرح کی دوسری خصوصیات کے حامل تھے جنہیں آپ کی سیرت پر تحقیق کرنے والا شخص آسانی سے معلوم کر سکتا ہے۔

بعض افسانے

گزشتہ گفتگو سے ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اکرم کے بارے میں ہدایت و رشد اور اللہ تعالیٰ کے قانون اور شریعت سے نا سازگار باتوں کی جو نسبت دی گئی ہے، ان سب کی کوئی صحیح بنیاد اور اساس نہیں ہے۔ یہاں پر ہم بطور مثال ان میں سے بعض موارد کا ذکر کرتے ہیں۔

بخاری اور دیگر افراد نقل کرتے ہیں کہ "زید بن عمرو بن نفیل کے لئے دستر خوان لگایا گیا جس میں غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ گوسفند کا گوشت تھا (بخاری کے نزدیک یہ دستر خوان نبی اکرم کے لئے بچھایا گیا) زید نے اسے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا میں ان چیزوں کو نہیں کھاتا جو بتوں کے نام پر ذبح ہوئی ہوں اور جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ احمد روایت کرتا ہے کہ رسول اللہ سفیان بن حرث کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے زید کا وہاں سے گزر ہوا انہوں نے اسے کھانے کی دعوت دی اس نے انکار کیا اور کہنے لگا ... الخ۔

احمد کہتا ہے کہ اس دن سے لے کر بعثت تک پھر آپ کو بتوں کے نام پر قربانی شدہ گوشت کھاتے ہوئے نہ دیکھا گیا۔

کہتے ہیں کہ زید بن عمرو بن نفیل قریش کی قربانیوں پر اعتراض کرتا تھا اور کہتا تھا

الخ ما تقدم۔ (۱)

پس اس بنا پر زید بن عمرو بن نفیل رسول خدا سے زیادہ عاقل دانا اور سمجھدار تھا (نعوذ باللہ) کیونکہ وہ بتوں کے لئے یا اللہ کا نام لئے بغیر ذبح شدہ گوشت کھانے کی قباحت اور برائی سے آگاہ تھا لیکن پیغمبر اکرم اس بات کو نہیں سمجھ سکے تھے اور (نعوذ باللہ) وہ گوشت کھاتے رہے جبکہ آپ تمام مخلوقات سے بالا تر اور دانا تر تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے حضرت عبدالمطلب کے دامن میں پرورش پائی تھی جو بتوں سے دور اور انہیں ٹھکرا چکے تھے اس کے بعد آپ اپنے چچا ابو طالب کے زیر سایہ پروان چڑھے نیز آپ نے عربوں کے اعلیٰ خاندان میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی جو دین حنیف کی تعلیمات سے سب سے زیادہ آگاہ تھا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ زید تو اپنی سمجھ بوجھ سے اس مطلب کا ادراک کر لے البتہ عسقلانی کی تحقیق کے مطابق (۲)، لیکن ختم الرسل اسے نہ سمجھ سکیں پس زید حضرت محمد کی نسبت نبوت کا زیادہ حقدار تھا نعوذ باللہ من الزلل فی القول و العمل ....۔

بعض لوگوں نے احتمال دیا ہے کہ شاید زید نے یہ بات یہود یا نصاریٰ سے سیکھی ہو۔ یہ احتمال اس وقت معقول ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ بتوں پر چڑھاوے کا گوشت اور وہ گوشت جس پر نام خدا نہ لیا گیا وہ نصرانیوں کے نزدیک بھی حرام ہو اور یہودی اپنے علاوہ کسی دوسرے کو اپنے دین کے اندر قبول ہی نہیں کرتے تھے اور اگر یہ بات یہودیوں کی طرف سے عام تھی تو زید کے علاوہ باقی لوگ اسے کیوں نہ جان سکے؟

۱۔ صحیح بخاری طبع مشکول مصریہ ج ۵ ص ۵۰ اور ج ۷ ص ۱۱۸ باب ما ذبح علی النصب و الاصنام، سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۳، مسند احمد ج۱ ص ۱۸۹ اور فتح الباری ج ۷ ص ۱۰۸ و ۱۰۹ اور الروض الانف ج ۱ ص ۲۵۶ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ فتح الباری ج ۷ ص ۱۰۹

بہرحال سہیلی نے کہا ہے کہ "اللہ تعالی نے کس طرح زید کو بتوں کی قربانی اور خدا کا نام لئے بغیر ذبح شدہ جانوروں سے اجتناب کرنے کی توفیق دی حالانکہ دور جاہلیت میں رسول اللہ اس فضیلت کے زیادہ حقدار تھے؟ کیونکہ آپ کے لئے عصمت الہی ثابت شدہ ہے"۔

پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتا ہے کہ "مذکورہ روایت اس بات پر کوئی دلالت نہیں کرتی کہ آنحضرتؐ نے اس دسترخواں سے کچھ تناول کیا ہو نیز ابراہیمؑ کی شریعت میں فقط مردار حرام تھا غیرخدا کیلئے کی جانے والی قربانی حرام نہ تھی پس زید نے سابقہ شریعت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی رائے اور نظریے کے مطابق بتوں کی قربانی کھانے سے ورع کیا" (۱)

لیکن یہ جواب نہایت ہی پھیکا ہے کیونکہ یہ بات غیر معقول اور نا قابل قبول ہے کہ جو امر شرع کے مطابق تھا زید نے اس کا ادراک کر لیا لیکن پیغمبر اکرمؐ اس کے ادراک سے ناتواں تھے۔

پھر کیونکر خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت جب آپ برہنہ ہوئے (البتہ ان کے نظریے کے مطابق) تو اللہ تعالی نے آپؐ کی مدد کی اور اس عمل سے آپ کو منع کیا پھر اللہ نے بتوں اور شعر کو آپ کے نزدیک مبغوض و منفور بنا دیا لیکن غیر خدا کے لئے ذبح شدہ جانوروں کے گوشت کھانے سے نہیں بچایا جبکہ بعض عام لوگ بھی جانتے تھے کہ یہ اللہ تعالی کے نزدیک پسندیدہ عمل نہیں ہے؟

بتوں کو چومنا یا تبرکاً چھونا

ان لوگوں کے خود ساختہ افسانوں میں سے ایک یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ بتوں کو متبرک سمجھ کر چھوتے تھے جبکہ خود یہی لوگ لکھتے ہیں زید بن عمرو بن نفیل جس کا تذکرہ

۱۔ الروض الانف ج ۱ ص ۲۵۶ اور سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۳، اس نے الروض الانف سے نقل کیا ہے اور فتح الباری ج ۷ ص ۱۰۹ کی طرف رجوع کریں۔

پہلے ہو چکا ہے، عمر بن الحویرث، ابو قیس ابن صرمۃ، قس بن ساعدہ، اسعد بن کریب، عبیداللہ بن جحش اور رباب بن البراء وغیرہ ہرگز بتوں کے آگے نہیں جھکے تھے اور وہ بتوں کی عبادت کو حرام سمجھتے تھے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیسے جان گئے جبکہ پیغمبر اکرمؐ نہ سمجھ سکے؟

نیز پیغمبر اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے کبھی بتوں کی پوجا کی تھی؟ آپؐ نے فرمایا: ہرگز نہیں۔

ابن حجر کہتا ہے: "علماء اس روایت کا انکار کرتے ہیں کہ آپؐ بتوں کو چومتے تھے"۔ احمد بن حنبل (جیسا کہ شفاء میں مذکور ہے) نے اس حدیث کو جعلی قرار دیا ہے۔ (۱)

بہرحال اس بارے میں بیہودہ باتیں بہت ہیں اور آپؐ پر باندھے گئے جھوٹوں کی تعداد کثیر و فراوان ہے خواہ یہ تہمتیں اور جھوٹ دوران فترت یعنی دور جاہلیت سے متعلق ہوں یا بعثت کے بعد سے مربوط ہوں۔ ان میں سے بعض کا ذکر آئندہ بحثوں میں آئے گا لیکن ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان سب کی تحقیق کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ بہت ہی دشوار ہے اس لئے موقع کی گنجائش کے پیش نظر اختصار سے کام لیتے ہوئے جو چیز زیادہ اہم، سود مند اور بہتر ہو اسی کو ہی بیان کرنا چاہیے۔

۱۔ دحلان کی سیرۃ نبویہ ج ۱ ص ۵۰ و ۵۱ اور سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۱۲۵ اور ۲۷۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

تیسری بات

ایک تحریک کی شرائط

کسی بھی قوم و ملت میں ایک تہذیب اور تحریک اور انقلاب کو وجود میں لانے کے لئے چند امور لازمی اور حتمی ہیں۔ یہاں پر ان کے بعض عام عناصر کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہے پھر ایک مختصر موازنے کے بعد ہم اسلام کی عظمت، بلندی اور اصالت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

ہماری گفتگو کے ہدف سے قارئین کی آگاہی اور سہولت کے لئے جزیرۃ العرب کے شمالی عربوں جو اہل حجاز کہلاتے ہیں اور جنوبی عربوں جو اہل یمن کہلاتے ہیں کے حالات کے درمیان ایک مختصر موازنہ پیش کیا جاتا ہے جس کے لئے درج ذیل نکات کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

الف: اہل یمن ایک خود کفیل اور زرخیز علاقے میں رہتے تھے ایسا علاقہ جس کے باشندے اگر زراعت پر ہی توجہ دیتے اور اسے اختیار کرتے تو وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکتے تھے علاوہ ازیں پہاڑی علاقے، بلند و بالا چوٹیوں اور دشوار گزار راستوں کی وجہ سے بہت سے موارد میں ان کی قدرتی مدد ہو جاتی تھی اور ان میں دشمن کے مقابلے کی طاقت

آجاتی تھی۔

چونکہ یمنی لوگ اپنی زمینوں پر کاشت کاری کرتے تھے اور اپنی فصلوں اور پیداوار کو اپنی زندگی اور بقا کا سرچشمہ سمجھتے تھے تو اس سرزمین سے ان کا لگاؤ ایک طبیعی امر تھا۔

اور بدیہی ہے کہ انسانوں کی اپنے وطن سے محبت کا ایک عنصر یہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے وطن پر اپنی سب سے قیمتی اشیاء حتیٰ کہ اپنا خون بھی قربان کر دیتے ہیں اگرچہ وہ وطن کا ایک چپہ ہی کیوں نہ ہو، اس بنا پر غالباً حب الوطنی زمین کی محبت سے پیدا ہوتی ہے اور زمین سے محبت عموماً اس شعور کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ سرزمین انسان کی ضروریات زندگی کو پورا کرتی ہے۔ اور اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق اس کی بقا کی ضامن ہے۔

ب: یمن میں ایک مضبوط مرکزی حکومت بھی قائم تھی جو نظم و نسق اور قانون کا اجراء کرتی تھی اور امن و امان اور آرام و سکون بہم پہنچانے کا بندوبست کرتی تھی۔

جب انسان امن و امان کی زندگی گزار رہا ہو اور قانون کے سائے تلے دن گزار رہا ہو اسے کسی دشمن کے اچانک حملے کا ڈر اور خدشہ بھی نہ ہو تو اسے اپنے موجودہ حالات زندگی کو اس سے بہتر اور کامل تر حالات میں تبدیل کرنے کے بارے میں غور و فکر کرنے اور سوچنے کا بہتر موقعہ میسر آتا ہے۔

ج: ایسی صورت میں انسان کو اپنے اہداف اور آرزوؤں کی تکمیل کرنے کا موقعہ ملتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے انسان تلاش و کوشش، محنت اور مشقت اور وسائل و ذرائع کو بروئے کار لاتا ہے۔

د: اس کے بعد تحریک کا اہم ترین اور موثر ترین مرحلہ آتا ہے کہ جو اکمل، جامع اور بہترین نظام کا موجود ہونا ہے ایسا نظام جو داخلی طور پر انسان کی تعمیر کرے اور خارجی طور پر اس کی محافظت کرے اور اس ذریعے سے ترقی و پیشرفت کے راستے میں پیش آنے والی تمام ممکنہ مشکلات اور دشواریوں کو برطرف کرے۔ اس نظام کے زیر سایہ انسانی اقدار

اور صلاحیتیں رشد و نمو پاتی ہیں نیز انسان کو اپنے حالات تبدیل کرنے اور اپنے روشن مستقبل کے لئے صحیح پیمانے پر منصوبہ بندی کا موقعہ فراہم ہوتا ہے۔

جب یہ تمام اسباب کسی ملت کیلئے فراہم ہو جائیں تو بلا شک و شبہہ وہ تیزی کے ساتھ ایک تمدن کی بنیاد رکھ سکتی ہے اور اپنا مستقبل روشن اور تابناک بنا سکتی ہے۔

آخری عامل کے علاوہ باقی تمام عوامل اور عناصر سر زمین یمن پر فراہم تھے۔ اسی آخری عنصر کے فقدان کی وجہ سے باقی وسائل اور اسباب سے بھی استفادہ نہ کیا جا سکا۔ تاریخ ہمیں قدیم یمن کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات بیان نہیں کرتی جو یمن کو امتیازی حیثیت کی حامل بنا دیتی ہو نہ ان کے فکری رشد اور تہذیب و تمدن کے بارے میں اور نہ ہی کسی دوسری چیز کے بارے میں اس دور کے یمن میں روشن فکری اور نظریاتی ترقی نام کی کوئی چیز جو ان کے پاس موجود وسائل کے مطابق ہو، بھی نہیں پائی جاتی تھی۔

جس طرح یہودیوں کا تحریف شدہ دین جو صدیوں سے ان پر حاکم رہا، اپنے پیروکاروں کے لئے کوئی ایسی قابل ذکر چیز پیش نہیں کرسکا جو ان کی حالت بدل دیتی یا ان کو جہالت کی تاریکیوں سے نجات دے سکتی ان کی مشکلات اور مسائل کو حل کرسکتی۔

یہودیت کی طرح روم میں تحریف شدہ عیسائیت اور ایران میں زرتشتیت (مجوسیت) اپنے تمام تر وسائل کے باوجود تہذیب و تمدن کے معرکے میں کوئی قابل ذکر کردار ادا نہ کر سکیں۔

لیکن حجاز کی سرزمین میں اگرچہ تمدن اور انقلاب کے مذکورہ عوامل اصلاً موجود نہیں تھے صرف آخری عامل موجود تھا اسی کی وجہ سے ایک وحشی اور ذلت و پستی میں زندگی گزارنے والی قوم ایک ایسی امت میں بدل گئی جس کا کوئی ثانی اور ہم پلہ نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ یہ امر واقعاً ایک معجزہ ہے۔

حجاز کے اکثر لوگوں کا پیشہ زراعت نہیں تھا کیونکہ یہ سرزمین پانی کی قلت کی وجہ سے زراعت اور کاشت کاری کے قابل نہ تھی اس علاقے میں نہ کوئی دریا تھا نہ ضرورت کے

مطابق بارش ہوتی تھی جو کچھ تھا اور ہے وہ صرف چشمے تھے جو سردیوں میں جاری ہوتے تھے لیکن گرمیوں میں خشک ہو جاتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ چشموں کی تلاش میں وہاں سے کوچ کر کے دوسری جگہوں کا رخ کرتے تھے البتہ حجاز کا کچھ علاقہ زرعی تھا لیکن وہ بہت تھوڑا تھا۔

بنابراین حجاز کی سرزمین میں کشش کا کوئی ایسا عنصر موجود نہیں تھا جو عربوں کو اس سے لگاؤ، محبت اور اس پر قربانی دینے پر مجبور کرتا اور ان کی حب الوطنی کا باعث بنتا بلکہ ان کی زندگی اور رزق و روزی شمشیر، اونٹ اور دوسرے چارپایوں سے وابستہ تھی اس لئے ان کے نزدیک انہی چیزوں کی اہمیت تھی لہذا ہم عرب شعراء کو دیکھتے ہیں کہ عرب شاعر تلوار، اونٹ اور گھوڑے کے بارے میں گیت گاتا ہے، وہ اس باد نسیم کی شان میں جو دشت عرب کی گرمیوں سے پیدا شدہ سنگین دکھوں اور غموں کو لحہ بھر کے لئے بھلا دیتی ہے غزل کہتا ہے اور چاند ستاروں کے ساتھ بہت زیادہ سرگوشیاں کرتا ہے۔

البتہ اگر وہ کبھی ہمیں اپنی دھرتی اور سرزمین پر آنسو بہاتا نظر آتا ہے تو وہ صرف اس لئے ہے کہ اس نے کچھ عرصہ وہاں گزارا اور اس سے مانوس ہوگیا ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر وہاں سے اس کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔

اور چونکہ عرب جنگ و غارت کو اپنا ذریعہ معاش سمجھتے تھے اس لئے وہ ان مواقع کو بہت یاد کرتا ہے اور غزل سرائی کرتا ہے اور اپنی ہر قسم کی مسلسل لوٹ مار پر افتخار کرتا ہوا نظر آتا ہے، خواہ پیدل کی ہو یا سوار ہو کر۔

دوسری طرف عربوں کو ہمیشہ جنگ، حملے اور لوٹ مار کا خطرہ رہتا تھا اسے کسی مرکزی حکومت کی مدد و حمایت کی امید بھی نہیں ہوتی تھی لہذا وہ ہمیشہ خوف اور وحشت سے دوچار رہتا تھا۔

جب امن و امان حاصل نہ ہو تو زندگی کے موجودہ حالات کے بارے میں کس طرح سوچا جا سکتا ہے اور ان حالات سے نجات حاصل کرنے کے لئے کیونکر چارہ کار کیا جا سکتا

ہے؟ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور جہات کو کس طرح چار چاند لگائے جا سکتے ہیں؟ مستقبل کی روشن راہیں حقیقت پسندی اور اطمینان کے ساتھ کیسے متعین کی جا سکتی ہیں تاکہ ان پر چل کر اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کی جا سکے اور زندگی کی بہتری کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جا سکے؟

تیسرا پہلو یہ ہے کہ کہاں اور کیسے آرزوئیں پنپ سکیں گی، بڑے بڑے ارمان کیسے پورے ہوں گے اور مقاصد کہاں پایہ تکمیل تک پہنچیں گے جب ہر روز اس کے ارمانوں کا قتل عام ہو جب ہر دن اس کی آرزو حسرت میں بدل جائے اور ہر گزرنے والا دن ایک تازے زخم کا اضافہ کر دے؟

مختصر یہ کہ حجاز میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی جو آسانی کے ساتھ اپنی طاقت، قدرت اور رعب و دبدبے کے بل بوتے پر قانون کا نفاذ کر سکتی اور اپنے احکام کا اجراء کر سکتی بلکہ ایسا کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ جس ملت سے اسے سروکار ہوتا وہ ایک وحشی اور قتل و غارت کی پروردہ ملت تھی جو کبھی یہاں ہوتی اور کبھی وہاں۔

ہم نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک دفعہ ایرانیوں اور عربوں کے درمیان جنگ کا معرکہ ہوا، لڑائی کا بازار گرم ہوا ایک شدید اور سخت معرکہ اور قتل و غارت کے بعد دونوں فریق رات کو استراحت کے لئے مختلف اطراف میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے، جب دن ہوا تو ایرانیوں نے اپنے دشمن کی طرف دیکھا انہیں نہ سردار لشکر نظر آیا اور نہ لشکر۔ وہ کیسے، کس وقت اور کہاں چلے گئے؟ انہیں کوئی سراغ نہ مل سکا اور اگر وہ جان بھی لیتے تو ان کے لئے مفید نہیں تھا چونکہ یہ عربوں کی عادت اور فطرت تھی۔

ان خصوصیات کے باعث وہ ایک انقلاب اور تمدن کے تمام اسباب و عوامل سے عاری تھے یہاں تک کہ وہ انقلاب اور تبدیلی کی خواہش بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کہاں یہ ہے کہ اس کا ارادہ رکھیں اور اس کے لئے کام کریں۔ علاوہ ازیں ان کی اجتماعی و انفرادی زندگی پر جن بری عادات اور صفات رذیلہ کا غلبہ تھا اور کمال کی جانب وہ ان کے مصائب و مشکلات

میں اضافے کا موجب نہ بنتیں اور انہیں چند قدم پیچھے نہ دھکیلتیں تو کم از کم کسی اصلاح اور تبدیلی کی بھی اجازت ہرگز نہ دیتیں۔

لیکن ان تمام نقائص اور خرابیوں کے باوجود انھوں نے خدائی مشن اور حق کو پا لیا اور وہ دین اور وہ رسولؐ بہت ہی کم مدت میں اس امت کو ذلت و گمراہی کی پستیوں سے نکال کر عزت و شرافت کی بلندیوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے ان کی تمام غلط رسومات اور ناپسندیدہ عادات کو بدل کر رکھ دیا انہیں جاہلیت کے بوجھ سے رہا کر دیا اور ان کے مصائب و آلام کے اسباب کو ختم کر دیا اور حقیقتاً یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔

اسلام نے بہت ہی کم عرصے اور چند ہی سالوں میں جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں آداب و رسومات میں ایک حقیقی اور بنیادی انقلاب پیدا کر دیا انہیں عدم کی وادی سے نکال کر بقا کا جام پلا دیا اور انہیں موت کے منہ سے نکال کر عرصہ حیات میں داخل کر دیا۔

اگر اس دور میں یہودیت، عیسائیت اور دوسرے ادیان و مذاہب میں تعمیر و اصلاح کی تھوڑی سی بھی صلاحیت ہوتی تو وہ حالات کو مساعد اور میدان کو ہموار پا کر اس دور کے دگرگوں حالات میں تبدیلی لا کر اپنا کردار ادا کر سکتے تھے اور یوں اپنے آپ کو جوا سکتے تھے جبکہ یہودیت اور عیسائیت تو قبل از اسلام عرب قبائل میں رائج تھیں لیکن وہ لوگوں کے افکار و کردار اور حالات زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی لانے سے عاجز تھیں بلکہ وہ اسی طرح اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے دوسروں کو لوٹتے تھے اور اپنے تمام برے اعمال اور غلط اوصاف پر باقی تھے بلکہ مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ فلاں عرب قبیلہ جو دین مسیحیت میں آ چکا تھا، اس دین کے بارے میں شراب پینے کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح یہودی بھی عربوں کے درمیان رہتے تھے عرب ان کا بہت احترام کرتے تھے اور انہیں علم و معرفت کا منبع سمجھتے تھے (اس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے) لیکن عربوں میں ان کے نظریات، افکار اور رفتار و گفتار کا ذرا بھی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔

چوتھی بات

اسلام کی ترویج و اشاعت کے عوامل

گذشتہ خلاصے کے بعد اب اس علاقے میں (جس کا تعارف کرایا گیا ہے) اسلام کی ترویج و اشاعت میں جو عوامل موثر تھے ان کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بعض عوامل کا تعلق رسول اللہ کی شخصیت سے ہے، بعض ان کی رسالت سے مربوط ہیں اور بعض امور ایسے بھی ہیں جو ان دو کے علاوہ دیگر عناصر سے متعلق ہیں۔ ان تمام کا درج ذیل امور میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مقام دعوت - مکہ

الف: ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے اپنی دعوت کا آغاز عربوں بلکہ غیر عربوں کے بھی نزدیک، مقدس ترین شہر سے کیا وہ سر زمین جس کی طرف دنیا کے مختلف حصوں سے انسانی قلوب کھینچے چلے آتے ہیں، وہ مقام جو لوگوں کی عقیدتوں، امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔

ب: البوطی کہتا ہے کہ "جزیرۃ العرب جغرافیائی طور پر اس دعوت کی دشواریوں اور سختیوں کو تحمل کرنے کے لئے مناسب تھا کیونکہ وہ اپنے اردگرد کی مختلف قوموں اور امتوں

کا مرکز تھا یہی امر اطراف کی قوموں اور ملکوں میں دعوت اسلامیہ کے آسانی کے ساتھ پھیلنے کا موجب بنا"۔ (۱)

طبیعی طور پر اگر یہ دین کسری (رومی) کے ملک میں ظاہر ہوتا تو قیصر کے پیروکار اس کی پیروی نہ کرتے اور اسی طرح اگر اس کے برعکس ہوتا۔ اس کی وجہ دونوں سپر طاقتوں کے درمیان موجود دشمنی و رقابت اور ان دو قوموں پر حاکم روحانی اور باطنی موانع تھے۔

ج: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اپنی دعوت کا نقطہ آغاز اس مقام کو قرار دیا جو ان دو سپر طاقتوں (ایران اور روم) اور دوسری طاقتور حکومتوں کے اثر و نفوذ سے بہت دور تھا۔

اس صورت میں کوئی ایسی طاقتور قوت نہ تھی جو آپؐ کی دعوت پر کاری ضرب لگاتی اور ابتدا ہی میں اسے خاموش کر دیتی۔ کیونکہ آپؐ نے جس ماحول اور محیط میں اسلام کی دعوت شروع کی اس میں اور عموی طور پر حجاز میں قبائلی نظام کا دور دورہ تھا لوگوں میں قبائلی تعصب کار فرما تھا اس میں موجود قوتوں کے درمیان طاقت کا مساوی مقابلہ تھا، مختلف اور متعدد قبائل وہاں آباد تھے ان میں سے قریش کے صرف دس یا کچھ زیادہ طائفے تھے جن میں بعض ایک دوسرے کے رقیب تھے اور بعض کو دوسروں سے خطرہ رہتا تھا۔

علاوہ ازیں عرب کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر وہ حرم کی حرمت کو پامال اور ختم کر دیں اور ایک گروہ دوسرے سے لڑیں تو دوسرے اعراب کے نزدیک وہ اپنی شان و شوکت اور اہمیت کو گنوا بیٹھیں گے اور اس کے نتیجے میں ان کے اہم ترین مفادات اگرچہ مکمل طور ختم نہ بھی ہوں تو کم از کم ان پر کاری ضرب ضرور لگے گی۔

۱۔ فقہ السیرۃ ص ۳۰

۲۔ رسولؐ اللہ کی ذاتی خصوصیات

الف: اس دعوت کے بانی حضرت محمدؐ قبیلہ قریش سے تھے جو عظمت و شرف، عزت و بزرگی اور اثر و نفوذ کے لحاظ سے عرب کے تمام قبائل میں سب سے بڑا قبیلہ شمار ہوتا تھا سب قبائل اسے نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً آپؐ کا تعلق ہاشم کے خاندان سے تھا جو پاکیزگی اور طہارت میں ممتاز تھا، مکے کی سیاست و زعامت کا مالک تھا کوئی بھی شرافت اور اعلیٰ مرتبے میں ان کا شریک اور ان کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔

پس حضرت محمدؐ کو عزت و آبرو اور مقام و منزلت کی ضرورت نہ تھی جس کے حصول کی خاطر آپؐ نبوت کا دعویٰ کرتے جیساکہ آپؐ بنی اسماعیل میں سے تھے اور سب لوگوں کے اندر خاندان اسماعیل کی طرف سے دعوت کو قبول کرنے کے لئے فضا ہموار تھی یہی خاندان محل نزول وحی تھا اور معدن طہارت شمار کیا جاتا تھا انشاء اللہ اس بات کا تذکرہ آئندہ "قبائل کو رسولؐ اللہ کی دعوت" کے حوالے سے آئے گا۔ مثال کے طور پر جب آپؐ نے اپنی دعوت قبیلہ "بنی عامر بن صعصعہ" کے سامنے پیش کی تو انہوں نے دعوت کو قبول کرنے کے لئے یہ شرط رکھی کہ آنحضرتؐ اپنے بعد اس قبیلے کو اپنا جانشین مقرر کریں بصورت دیگر وہ دعوت قبول نہیں کریں گے۔ آپؐ نے بھی ان کی شرط کو ٹھکرا دیا وہ اپنے علاقے میں لوٹ جاتے ہیں اور اس واقعے کو ایک معزز بوڑھے مرد سے بیان کرتے ہیں وہ اپنا سر تھام کر کہتا ہے اے بنی عامر! کیا اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے؟ جو کچھ ہم نے گنوا دیا ہے کیا اسے دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے؟ مجھے قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے خاندان اسماعیل میں سے کسی نے بھی خواہ مخواہ نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اس شخص کا دعویٰ قطعاً حق ہے تم نے کیوں صحیح فیصلہ نہیں کیا اور اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ (۱)

۱۔ یہ بات اپنے موقعہ و محل پر مآخذ کے ساتھ ذکر ہوگی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

ب: آنحضرتؐ کی ان خصوصیات و صفات اور ان خصوصیات کا جن کی طرف حضرت جعفر بن ابی طالب نے اشارہ کیا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ایک رسول بھیجا جو ہم میں سے ہے ہم اس کے نسب، صداقت اور عفت و پاکیزگی سے اچھی طرح واقف ہیں" آپؐ کی دعوت کے ظہور اور رسالت کی کامیابی میں بہت بڑا کردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے خلق عظیم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ اور فرمایا ہے: "و انک لعلی خلق عظیم". (۳) یعنی آپؐ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں۔

مذکورہ مطالب کے علاوہ ہم درج ذیل باتوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد خود رسول اللہ کی اپنی رسالت پر گواہی سے مسلمان ہوتے ہیں۔ منقول ہے کہ ایک اونٹ سوار باہر سے داخل ہوا اس نے اونٹ کو مسجد میں بٹھایا اور اسے ایک جگہ باندھ دیا، اس نے لوگوں کی طرف منہ کر کے پوچھا تم میں سے محمدؐ کون ہے؟ راوی کہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کے درمیان ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ ہم نے جواب دیا یہی ٹیک لگائے سفید رنگ شخص ہیں۔ اس شخص نے آنحضرتؐ سے پوچھا: کیا تم عبدالمطلب کے بیٹے ہو؟ آپؐ نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر اس نے کہا میں آپؐ سے چند سوال سختی کے ساتھ کروں گا؟ لہذا آپؐ ناراض نہ ہونا۔ آپؐ نے فرمایا: جو چاہتے ہو پوچھو ! اس شخص نے کہا میں آپؐ کے خدا اور پہلے انسانوں کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام لوگوں کے لئے مبعوث فرمایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: پروردگار کو گواہ قرار دے کر کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ پھر اس نے کہا: اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اس نے آپؐ کو روزانہ پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے؟ پیغمبر اکرمؐ نے جواب دیا کہ خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہے اس نے پھر کہا: ... یہاں تک کہ راوی کہتا ہے کہ آخرکار

۱۔ سورہ قلم، آیت ۴ آیت میں ایک اور احتمال بھی دیا گیا ہے لیکن وہ متبادر مفہوم کے برخلاف ہے۔

اس شخص نے کہا جو آپ لائے ہیں میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ میں اپنی قوم کا نمائندہ ہوں اور میں ضمام بن ثعلبۃ ہوں۔ (۱)

ضمام کا اصحاب کے درمیان رسول اللہ کو پہچان نہ سکنا آپ کے خلق عظیم کی بہترین دلیل ہے نیز یہ اس امر کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام حاکم اور رعایا کے مابین بناوٹی فرق کو قبول نہیں کرتا، اسلام اس کا قائل نہیں کہ حکومت حاکم کے لئے ایک قسم کا امتیاز ہے بلکہ وہ اسے ایک مسئولیت اور ذمہ داری سمجھتا ہے۔

اسی طرح خود آنحضرت کی شہادت پر ضمام کا اسلام لے آنا آپ پر حد درجہ اطمینان کی بھی حکایت کرتا ہے کیونکہ دعوت کی قبولیت اور پیغام کے پھیلنے میں اس اطمینان اور اعتماد کا بہت بڑا دخل ہے۔

علاوہ ازیں قریش کے لوگ پیغمبر اکرم کے کمال عقل، حسن تدبیر اور رائے کی پختگی سے اچھی طرح آگاہ تھے (جیساکہ خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقعہ پر حجرالاسود کو اسکے مقام پر نصب کرنے کے مسئلے میں آپ کے بہترین فیصلے کا تذکرہ ہوچکا ہے)۔ اسکے علاوہ صداقت اور امانت میں آپ کو شہرت تھی یہاں تک کہ آپ کو صادق اور امین کا لقب دیا گیا۔

اسی طرح آپ کی ولادت اور اس کے بعد جو روشن دلائل اور عجیب واقعات رونما ہوئے نیز یہ کہ آپ دو قربانیوں کے فرزند تھے ان باتوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں آپ کیلئے خصوصی عزت و احترام اور مقام و مرتبہ تھا۔

ہاں یہی وجوہات تھیں جو قریش اور دیگر لوگوں کو ایک حقیقت کے مقابلے میں لاکھڑا کرتی تھیں۔ پس جو شخص بھی آپ کی تکذیب کرنے پر اتر آتا وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا

۱۔ بخاری بر فتح الباری کا حاشیہ ج ۱ ص ۱۳۱-۱۳۹ اور خود فتح الباری کی طرف مزید مآخذ سے آگاہی کے لئے رجوع کریں۔ البدایہ و النہایہ ج ۵ ص ۶۰ جو ابن اسحاق سے نقل کرتا ہے نیز دیکھئے تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۸۴

ہوجاتا کیونکہ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا اور کہتا تھا کہ تم سچ مچ جھوٹ بکتے ہو اور وہ (ص) صادق و امین اور مکمل طور پر قابل اطمینان ہے، تم خیانت کے مقام پر ہو جبکہ وہ (ص) اہل تدبر اور صاحب تدبیر و صاحب عقل عظیم ہے اور تم نادان اور جاہل مقصر ہو یہی حال ہے آپ کی دیگر عالی صفات اور بلند و بالا اخلاق کا۔

۲۔ اسی مطلب کی تائید اور تقویت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ہر شخص آپ کے امی ہونے کے بارے میں جانتا تھا اور اس سے آگاہ تھا کہ آپ نے علم و معرفت کا سبق کسی سے نہیں پڑھا ہے لیکن اب وہ ایسی چیز لایا ہے کہ کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں میں سے کوئی اس کے ایک جزء کے بھی مکمل علم کا دعوی نہیں کر سکتا چہ رسد اس ماحول کے لوگوں کا جو ظلمت و جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بنابر ایں آپ کی صداقت اور دعوت کی سچائی میں سوائے خود پسند، خود غرض اور ضدی شخص کے کسی کے لئے بھی شک و شبہہ کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔

۳۔ علاوہ ازیں پیغمبر اکرم نے کبھی بھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا تھا لہذا کوئی بھی آپ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا کہ آپ کل تک تو خود بتوں کو سجدہ کرتے تھے اور بت پرست تھے آج کیوں ان سے بیزار ہوگئے۔ اور ان کا انکار کر رہے ہو اور اگر ان کی پرستش عقل و فطرت کے خلاف ہے تو کل تک آپ کی عقل کہاں تھی اور آپ کی فطرت نے آپ کی رہنمائی کیوں نہیں کی۔

۴۔ اس کے بعد آپ کی استقامت، تمام مشکلات اور مصائب پر صبر و تحمل، ہر قسم کی سودے بازی سے انکار (یہاں تک کہ اگر آپ کے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیتے تاکہ آپ اپنے راستے کو چھوڑ دیں تب بھی آپ فریضہ الہی سے دست بردار نہیں ہوتے) وغیرہ آپ کی کامیابی کے عوامل تھے۔ بلکہ کفار اس شرط پر اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے کہ پیغمبر اکرم انہیں کچھ مدت تک بتوں کی عبادت کی مہلت دے دیں تاکہ وہ ان کی عبادت سے بہرہ مند ہو جائیں۔ آپ نے ان پر واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ پیغمبر کے

اختیارات کی حدود سے خارج ہے اور آسمانوں کے پروردگار کے ہاتھ میں ہے اور وہی ان سے عبادت چاہتا ہے۔

۳۔ اجتماعی حالت

گذشتہ باتوں کے تذکرے کے بعد اب ہم اس دور کی اجتماعی و معاشرتی حالت کو بیان کرتے ہیں اس زمانے میں لوگ نہایت مشقت اور شدید مشکلات میں زندگی گزار رہے تھے۔ عربوں کے اجتماعی حالات کے حوالے سے آغاز کتاب میں امیر المومنین حضرت علیؑ کے مذکورہ کلمات اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کے حالات غیر عربوں کے حالات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ یہاں پر ہم حضرت جعفرؓ کی گفتگو جو انھوں نے حبشہ کے بادشاہ کے سامنے کی پیش کرتے ہیں۔ جب عمرو عاص حبشہ کے بادشاہ کو دھوکا دینا چاہتا تھا تو حضرت جعفرؓ نے فرمایا: "ہم ایک جاہل اور بت پرست قوم تھے، ہم مردار کھاتے تھے، فحشاء کو انجام دیتے تھے، اپنے رشتہ داروں سے قطع رحمی کرتے تھے، ہمسایوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے، طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے تھے ..."۔

اس قسم کے برے حالات اس قوم کا مقدر بنے ہوئے تھے یہ مہلک سایہ ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا جن کے نتیجے میں عہد جاہلیت کے انسان کے اندر ذہنی طور پر حق کو قبول کرنے اور اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے آمادگی پیدا ہوگئی تھی یہ امر اس بات کا بھی موجب بنا کہ وہ دعوت حق کے بارے میں کاوش کرے اور سمجھ لے کہ اپنی بلاؤں اور مصیبتوں میں کمی کر کے اپنے آپ کو اس درد ناک اور بری صورت حال سے رہائی دلا سکتا ہے۔ حضرت جعفر بن ابیطالبؓ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بادشاہ حبشہ سے فرمایا: "ہم ایسے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان سے ایک پیغمبرؐ کو ہمارے لئے مبعوث کیا۔ جس کے نسب، صداقت، امانت داری اور شرافت و پاکیزگی کو ہم پہلے سے جانتے تھے۔ اس نے ہمیں یکتا پرستی اور خدا پرستی کی دعوت دی۔ اس نے ہمیں ان پتھروں اور بتوں کی

پرستش چھوڑنے کے لئے کہا جن کو ہم اور ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت داری و صلہ رحمی کرنے، ہمسایوں سے اچھا سلوک کرنے، بے حیائی اور برے کاموں سے بچنے اور خونریزی نہ کرنے کی تلقین کی۔ اس نے ہمیں برے اعمال، بیہودہ گفتگو، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا ...“۔

اہل مدینہ نے اسعد بن زرارہ کی زبانی اس امید کا اظہار کیا کہ رسول اللہ اپنی دعوت کے ذریعے ان کی لا علاج مشکلات کو حل کریں، مؤرخین لکھتے ہیں کہ اوس و خزرج دن رات اسلحہ اٹھائے رکھتے تھے اور کسی وقت بھی اسلحہ زمین پر نہیں رکھتے تھے بنابرایں بطور طبیعی وہ اس حالت سے چھٹکارے کی خواہش کرتے تھے تاکہ صحت اور امن و امان کی نعمت سے بہرہ مند ہوں جن سے وہ نا آشنا تھے۔

مدینے میں اسلام کی آمد کی بحث کے دوران ہم اس سلسلے میں بحث کریں گے۔ یہاں پر اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مستضعفین، فقراء اور غلاموں کے اندر ہی اسلام کی طرف رجحان واضح اور زیادہ تھا لیکن ابوجہل اور ابوسفیان جیسے مستکبروں، ظالموں، مالداروں، سرمایہ داروں اور مفاد پرستوں کا ٹولہ ہی تھا جن کی یہ کوشش تھی کہ اس اسلام کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ دیں اور اس دعوت کو پھیلنے سے روکیں۔ مکے کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہمارے عرائض کی تائید میں بہت سارے شواہد کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

۴۔ حضورؐ کے معجزے کی نوعیت

اسلام کی ترویج و اشاعت میں آنحضرتؐ کا معجزہ بھی بہت حد تک دخیل تھا۔ کیونکہ قرآن نے عربوں کو حیرت میں ڈال دیا نہ صرف اپنے جامع عمومی قوانین غیب کی خبروں اور سبق آموز داستانوں جو ان کی کتب میں مذکور تھیں واقعات کی تائید کرتی تھیں دیگر علوم و معارف کی بنا پر بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ قرآن نے معجزے کے طور پر عربوں کو مغلوب اور مبہوت کر دیا کیونکہ وہ اور دوسری غیر عرب قومیں فصاحت و بلاغت کو عربوں کی میراث سمجھتی

تھیں اور وہ اسے اپنے سے مختص سمجھتے تھے۔ ہاں پیغمبر اکرمؐ کے لئے ایسے معجزے کے انتخاب نے ان پر حجت قائم کر دی اور ان سے ہر دوسری چیز کا اختیار سلب کر لیا کیونکہ اس ماحول میں ایسے پیغمبرؐ کے ایسی حجت کے ساتھ آنے سے، وہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوگئے کیونکہ بصورت دیگر وہ اپنے آپ کو اور دوسرا شخص بھی ان کو حق کا دشمن اور باطل کا ساتھی پاتا۔

ہاں قرآن نے انہیں مات اور مبہوت کر دیا ان سے اختیار کی قوت سلب کر لی وہ یا تو اس کا انکار کر دیتے درحالیکہ وہ حقیقت کو جانتے تھے۔ "و جحدوا بہا و استیقنتہا انفسہم"۔ (۱) یعنی انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا جبکہ انہیں ان کا یقین تھا، یا پھر ایمان لے آتے اور حق کے آگے جھک جاتے۔

جب ہم یہ جانتے ہیں کہ عربوں کی خصوصیات انکی فطرت اور زندگی کے تقاضوں میں سے ایک ہے کہ انکی زندگی صحیح معنوں میں آزاد تھی اور ان کے افکار بناوٹی اور جھوٹے افکار سے آلودہ نہیں تھے (جیساکہ دوسری قومیں مثلاً روم اور ایران ان میں مبتلا تھیں اور خلاف فطرت فلسفہ ادیان کو خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں) تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ قرآن، عربی اللسان کی فطرت سے ہم آہنگ اور اسکی طبیعت، مزاج، صفائے نفس اور عادات سے ہر لحاظ سے سازگار تھا جس طرح خود اسلام عربوں کی فطرت اور روح سے مطابقت رکھتا ہے۔ عربوں کی عقل، ضمیر، وجدان اور باطن اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں کیونکہ وہ فطرت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور اسلام دین فطرت ہے۔ "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم۔" (۲) یعنی یہی خدا کی فطرت (خلقت) ہے جس پر اس نے لوگوں کو خلق کیا ہے اوراس کی خلقت (بناوٹ)

۱۔ سورہ نمل، آیت ۱۴

۲۔ سورہ روم، آیت ۳۰

میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ یہی مضبوط اور بالکل سیدھا دین ہے۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہت جلد اپنا مال اپنی اولاد اور خون اس دعوت کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس دین کی خاطر اپنے باپ اور بھائی کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور قرآن کے اعجاز کا راز آئندہ فصلوں میں بیان ہوگا۔

۵۔ آنحضرتؐ کی نبوت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی بشارتیں

عرب علاقے میں ایک پیغمبر کے ظہور کے نزدیک ہونے کے بارے میں اہل کتاب نے جو بشارتیں دے رکھی تھیں انہوں نے بھی دعوت اسلام کے جلد اور با آسانی پھیلنے میں اپنا اثر دکھایا۔

تورات میں آیا ہے کہ "یہ وہی برکت ہے جس کی بندہ خدا موسیٰ نے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو مبارک باد دی۔ اس نے کہا رب سینا سے آیا اور اس نے ساعیر سے ان پر شعاعیں ڈالیں اور فاران کے پہاڑ سے ان پر نور افشانی کی"۔ (۱)

سینا سے آمد، سینا میں حضرت موسیٰؑ سے خدا کے کلام کیلئے کنایہ ہے۔ ساعیر سے مراد فلسطین کے پہاڑ ہیں اور عیسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے اور فاران سرزمین مکہ کا قدیم نام ہے۔ (۲) کہ جس میں ہمارے نبی اعظم محمدؐ پر قرآن نازل ہوا، جن کے علاوہ کسی نے ظہور نہیں کیا۔

حضرت محمدؐ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں جس نے اپنے بیٹوں کو اس پردیس میں چھوڑ دیا تھا۔ تورات اس بارے میں یوں گویا ہے: "پردیس کی سرزمین کی ابدی حکومت یعنی تمام سرزمین کنعان کی حکومت تمہیں اور تیری آئندہ نسل کو عطا کرتا ہوں"۔ (۳)

۱۔ سفر تثنیہ، اصحاح ۳۳ فقرہ ۱

۲۔ معجم البلدان حموی ج ۴ ص ۲۲۵

۳۔ سفر تکوین اصحاح ۱۷ فقرہ ۸

حضرت ابراہیمؑ کی سرزمین غربت (پردیس) سے مراد صرف مکہ ہے جہاں انہوں نے اپنے خاندان کو ساکن کیا اور سرزمین کنعان اگرچہ وہی شام ہے لیکن یہاں پر بطور مجاز تمام سرزمین عرب مراد ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے شام کا سفر نہیں کیا اور اپنی اولاد کو وہاں رہائش پذیر نہیں کیا۔

انجیل یوں بیان کرتی ہے: "یہ یوحنا کی شہادت ہے جب یہودیوں نے یروشلم سے اپنے علماء اور لاویون (یہودیوں کے علماء کا نام ہے) کو ان کے پاس یہ پوچھنے کے لئے بھیجا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اعتراف کیا اور اظہار کیا میں مسیح نہیں ہوں، پس اس سے انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ کیا تم ایلیا ہو؟ اس نے جواب دیا میں ایلیا نہیں ہوں پھر پوچھا پس تم وہی پیغمبر ہو اس نے کہا نہیں"۔ (۱)

ایلیا سے مراد (جیساکہ کہا گیا ہے) حضرت الیاسؑ نہیں ہیں کیونکہ ان کا زمانہ نبوت حضرت سے چند صدیاں پہلے گزر چکا تھا پس اس سے مراد ایسا شخص ہونا چاہیے جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد آئے اور یہی حال ہے اس نبی کا جس کے بارے میں انہوں نے سوال کیا۔ پس چونکہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ہمارے نبی حضرت محمدؐ اور ان کے اوصیاء کے علاوہ کوئی نہیں آیا اس لئے شاید پیغمبرؐ سے مراد حضرت محمد اور ایلیا سے مراد آپؐ کے وصی حضرت علیؑ ہوں۔

پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے متعلق عہدین (تورات اور انجیل) کی پیشگوئیاں بہت زیادہ ہیں اس بارے میں لکھی گئی کتب کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ (۲) البتہ یہ بات مدنظر رہے کہ موجودہ تورات اور انجیل تحریف اور کمی بیشی سے دوچار ہوئی ہیں جیساکہ جناب بلاغی مرحوم کی کتاب "الھدی الی دین المصطفیٰ" اور "الرحلۃ المدرسیۃ" کے مطالعے سے یہ

۱۔ انجیل یوحنا حصہ ۱ بند ۲۱-۱۹

۲۔ انیس الاعلام، الرحلۃ المدرسیۃ، الھدی الی دین المصطفیٰ، رسول الاسلام فی الکتب السماویۃ اور دیگر مآخذ

بات عیاں ہوتی ہے۔ اسی طرح رحمت اللہ ہندی کی کتاب "اظہار الحق" اور دوسری کتابوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

یہاں پر کافی ہے کہ اہل کتاب کے بارے میں جو کچھ قرآن کہتا ہے اس کا ذکر کیا جائے۔ قرآن فرماتا ہے: "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم، و ان فریقاً منھم لیکتمون الحق، و ھم یعلمون". (۱) یعنی وہ اسے ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ان میں سے ایک گروہ حق کو چھپاتا ہے جبکہ وہ اسے جانتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "الذین یتبعون النبی الامی، الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ و الانجیل، یامرھم بالمعروف، و ینھاھم عن المنکر، و یحل لھم الطیبات ...". (۲) یعنی جو لوگ اس نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں مرقوم پاتے ہیں وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے اور پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال قرار دیتا ہے۔

اگر اہل کتاب قرآن کے اس دعوی کو غلط ثابت کر سکتے تو وہ ضرور یہ اقدام کرتے اور انہیں نور خدا کو خاموش کرنے کے لئے فتنہ برپا کرنے اور جنگیں کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اسی طرح مشرکین مکہ جن کا ان سے قریبی رابطہ تھا وہ قرآن کے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیتے۔

بلکہ وہ عربوں کو دھمکی دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "ضرور ایک نبی آئے گا جو تمہارے بتوں کو توڑ دے گا لیکن جب آنحضرتؐ نے ظہور کیا تو انہوں نے کفر اختیار کیا"۔ (۳)

مغلطای کہتا ہے کہ جب آپؐ کی پیدائش سے پہلے مشہور ہوگیا کہ محمدؐ نام کا پیغمبر

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۴۶

۲۔ سورہ الاعراف، آیت ۱۵۷

۳۔ بحار الانوار ج ۱۵ ص ۲۳۱

ظہور کرے گا تو بہت سے لوگوں نے اپنے بیٹوں کا نام اس امید سے محمد رکھ لیا کہ شاید وہ وہی پیغمبر موعود ہو۔ ان میں سے ایک محمد بن سفیان بن مجاشع ہے الخ ... پھر اس نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کا یہ نام رکھا گیا۔ (۱)

جب ہجرت سے پہلے رسول اسلامؐ نے مدینہ کے بعض لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ وہی چیز ہے جس کی ہمیں یہودی خبر دیتے تھے کہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگی۔ اسی طرح جب ان کے اور یہودیوں کے درمیان نزاع پیدا ہوگیا تو یہودیوں نے کہا ہم ایک ایسے پیغمبر کے مبعوث ہونے کا انتظار کر رہے ہیں جو عاد اور ثمود کی قوم کی طرح تمہیں نابود کر دے گا ہم اس کی پیروی کرتے ہوئے تمہارے خلاف اس کی مدد و حمایت کریں گے ... ۔ (۲)

اہل کتاب کے رہائشی علاقے

عیسائی جزیرۃ العرب کے مرکز میں نہیں تھے بلکہ اس کے اطراف یعنی حیرہ اور شام کے شہروں میں رہتے تھے بعض عرب قبائل مسیحی تھے البتہ ان کے بقول شراب خوری کے علاوہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

یہودی سخت دباؤ اور مصائب کی وجہ سے فلسطین سے فرار کر کے یثرب چلے گئے وہاں وہ پہلے حکمران تھے اس کے بعد اوس اور خزرج یثرب پہنچے جو یمن کے قحطانی تھے وہ یہودیوں پر غالب آ گئے انہوں نے یہودیوں کو کہ جو تین قبیلوں بنی النضیر، بنی قینقاع اور بنی قریظہ پر مشتمل تھے، مدینہ اور اس کے اطراف میں مخصوص مقامات پر محصور کر دیا اسی طرح وہ فدک اور تیماء میں بھی رہائش پذیر تھے۔

۱۔ سیرۃ مغلطای ص ۷

۲۔ ابن حبان کی الثقات ج ۱ ص ۹۰

ھیکل کہتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے مکے میں رہائش رکھنا ممنوع تھا مگر مزدور اور اجیر کی حیثیت سے بشرطیکہ اپنے دین اور کتاب کے بارے میں وہ کوئی بات نہ کہیں۔ دوسرے مقامات پر یہودی غلاموں کو اس ممنوعیت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ (۱)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض عیسائی عرب مثلاً ورقہ بن نوفل اور اس جیسے دوسرے افراد مکہ میں رہائش پذیر تھے۔ بہرحال اس بات کی تحقیق ہمارے لئے کوئی زیادہ اہم نہیں ہے۔

اہل کتاب اور عربوں پر ان کا علمی دبدبہ

یہاں پر جس نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ عرب اہل کتاب کے سامنے یوں اظہار تواضع کرتے تھے جس طرح شاگرد استاد کے سامنے، وہ انہیں اپنی معرفت اور ثقافت کا سرچشمہ خیال کرتے تھے۔

اس بارے میں تاریخ میں ہم یہاں تک دیکھتے ہیں کہ جب عرب اسلام کی طرف مائل ہوتے تو وہ احبار اور راہبوں سے مشورہ کیا کرتے تھے بلکہ ہم بعض موقعوں پر مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے ایک قبیلے کو دعوتِ اسلام دی تو وہ قبیلہ پورے کا پورا فدک کے یہودیوں کے پاس گیا اور ان سے رسول اللہ کے بارے میں پوچھا۔ (۲)

قبیلہ کندہ کے سامنے اسلام پیش کیا جاتا ہے اور وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں ان میں سے بعض رسول اللہ کی حقانیت پر یہودیوں کی اس پیشگوئی سے استدلال کرتے ہیں کہ بہت جلد حرم سے ایک نبی ظہور کرے گا اور اس کا زمانہ آ پہنچا ہے۔ (۳)

۱۔ محمد حسین ھیکل، حیات محمد ص ۶۵ و ۶۶

۲۔ البدایہ و النہایۃ ج ۳ ص ۱۳۵ اور دلائل النبوۃ (ابو نعیم) ص ۱۰۲ کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ ابونعیم، دلائل النبوۃ ص ۱۰۳

ابتداء میں اہل مدینہ کے اسلام کی بنیاد ایسے ہی دلائل اور براہین پر استوار تھی (جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) آگے چل کر انھیں مزید بیان کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالی)

حیرہ کا ایک وفد اور کعب بن عدی اسلام لے آئے جب حضور اکرمؐ کی رحلت ہوئی تو وہ مرتد ہوگئے لیکن کعب بن عدی اپنے اسلام پر باقی رہا اس نے خود اس بارے میں یوں کہا ہے: "میں مدینہ جانے کے لئے نکلا راستے میں میں نے ایک راہب سے ملاقات کی جس کے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے"۔ (۱) اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے راہب پر پورا اعتماد تھا اور اس کے اسلام کی وجہ وہی (راہب) تھا۔ اس کے قول پر غور کریں وہ کہتا ہے کہ "ہم اس کے قول کے بغیر کوئی بھی فیصلہ نہیں کرتے تھے"۔

اسی طرح آئندہ ذکر ہوگا کہ ابو سفیان نے کعب بن اشرف سے سوال کیا کہ خدا کے نزدیک کونسا دین زیادہ پسندیدہ ہے تمہارا دین یا محمدؐ کا دین؟

جنگ خندق میں بعض گروہوں کو شریک کرنے کے لئے جب یہودی مکے آئے تو انھوں نے، بنی نضیر کے بعض یہودیوں نے سلام ابن ابی الحقیق، حیی بن اخطب اور کنانہ بن الربیع سے کہا کہ اے یہودیوں کی جماعت! تم پہلی کتاب والے ہو اور ہمارے اور محمدؐ کے درمیان اختلاف سے با خبر ہو کیا اس کا دین بہتر ہے یا ہمارا دین؟ یہودیوں نے کہا: تمہارا دین اس کے دین سے بہتر ہے اور تم حق کے اہل ہو۔ جب انھوں نے قریش سے یہ بات کی تو وہ خوش ہوگئے اور جس مقصد کے لئے ان کے پاس آئے تھے اس سے وہ پر امید ہوگئے۔ (۲)

ہم جانتے ہیں کہ سرداران قریش حق کو خوب پہچانتے تھے لیکن اپنی دشمنی اور تکبر کی

۱۔ الاصابة ج ۳ ص ۲۹۸ از بغوی و ابن شاہین و ابن سکن و ابن یونس تاریخ مصر میں و ابونعیم۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۳ ص ۲۲۵ و ۲۲۶

وجہ سے اسے ظاہر نہیں کرتے تھے کیونکہ خود خدا ارشاد فرماتا ہے۔ "و جحدوا بها و استیقنتها انفسهم"۔ (۱) یعنی انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا جبکہ دل سے وہ اس پر یقین رکھتے تھے۔

لیکن جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہودیوں کے اثر و رسوخ اور ان کی علمی برتری سے استفادہ کرتے تھے اور یہودیوں کو اپنی دینی تعلیمات کا منبع و مآخذ سمجھتے تھے۔ موقع کی مناسبت سے عرض کرتے چلیں کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے آج بالکل عصر جاہلیت کی طرح مسلمانوں کی نظریں یورپ والوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

آخر میں حلبی اور ابن ہشام کے اقوال کو نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ "یہ بات مخفی نہ رہے کہ کفار قریش نے نضر بن حرث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودی علماء کے پاس مدینہ بھیجا اور ان سے کہا ان سے محمدؐ کے بارے میں پوچھ آؤ انہیں اس کی صفات بتاؤ اور اس کا تعارف کراؤ کیونکہ وہ پہلی کتاب (توراۃ) کو ماننے والے ہیں۔ (۲) اس کے بعد جو واقعہ ان کے اور یہودیوں کے درمیان پیش آیا نیز مکے میں آنحضرتؐ اور کفار کے درمیان جو کچھ ہوا، اس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل کتاب کی پیشگوئیوں کے ذریعے عربوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوچکی تھی کہ اس سرزمین پر بہت جلد ایک پیغمبر مبعوث ہوگا اور اس بات نے ان کیلئے آنحضرتؐ کی دعوت کے قبول کرنے کو آسان بنا دیا اور جس حقیقت کو آپؐ لے کر آئے تھے اس پر یقین کر لینے کی راہیں ان کے لئے ہموار کر دیں کیونکہ (ان طاغوتوں کے علاوہ) باقی عرب لوگ اپنی صاف طبیعت اور روح کی پاکیزگی کے باعث حق کو قبول اور اس پر یقین کر رہے تھے۔ ان کا قبیلہ اور آداب و رسوم فقط انہیں ایک دوسرے کے مقابلے میں اطاعت اور

۱۔ سورہ نمل، آیت ۱۴

۲۔ سیرۃ الحلبیۃ ج ۱ ص ۳۱۰ و سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۲۱

فرمان برداری سے روکتے تھے وہ بھی ان کی سخت مزاجی، غیرت اور بلند ہمتی کے سبب تھا ورنہ انہیں حق کے قبول کرنے اور پیام آسمان پر ایمان لانے سے نہیں روکتے تھے۔ (۱)

۲۔ سیاسی اور نظریاتی خلا

الف۔ نظریاتی خلا

اہل عرب خطرناک قسم کے نظریاتی خلا کا شکار تھے اس بارے میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے گذشتہ کلام میں یوں فرمایا تھا: "اللہ تعالی نے رسول اکرمؐ کو اس حال میں مبعوث فرمایا جب لوگ گمراہ اور سرگرداں تھے، فتنوں میں غرق تھے، پیچیدہ مسائل میں پریشان اور مضطرب تھے اور جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے"۔

ان کی بت پرستی بھی قبائلی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ہر قبیلے بلکہ ہر خاندان کا اپنا بت تھا ان کی بت پرستی جذبات پر مبنی تھی اور عقل و منطق کے طور طریقوں سے دور تھی ان کا کسی بت سے رابطہ ان کے آباء و اجداد کی تاریخ سے اس بت کی وابستگی کی وجہ سے تھا۔ یہ مقتضائے طبیعت عرب تھا کہ اپنے نسب اور جو چیز ان سے منسوب تھی اس پر فخر کرتے تھے۔ قرآن اس بارے میں ان سے یوں حکایت کرتا ہے۔ "بل قالوا انا وجدنا آبائنا علی امة، و انا علی آثارھم مھتدون". (۲) یعنی ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

جو امور اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی بت پرستی عقلی اور وجدانی اصولوں پر استوار نہیں تھی، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو لوگ اپنی عقل اور فطرت کی طرف رجوع کرتے تھے وہ اسے فطرت اور عقل سلیم کے منافی پاتے اور تیزی سے اس ماحول اور صورتحال

۱۔ جاحظ، البیان و التبیان ج ۳ ص ۱۲۷

۲۔ سورہ زخرف، آیت ۲۲

سے نکلنا چاہتے تھے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرت عبدالمطلب بت پرستی سے دور تھے اسی طرح انہوں نے کہا ہے کہ ورقہ بن نوفل، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل اور عبیداللہ بن جحش بتوں کی پرستش سے اجتناب کرتے تھے ان کے بتوں پر کمزور اعتقاد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا، پہلے دو نے عیسائیت کو قبول کر لیا جبکہ باقی دو شک و تردد اور حیرت میں باقی رہے۔ (۱)

ب۔ سیاسی خلا

عرب کی خشک اور جلا دینے والی سر زمین، خانہ بدوشی، مشکلات پر صبر و تحمل اور قوت برداشت جیسے عوامل نے عربوں پر تسلط کو تقریباً محال بنا دیا تھا جیساکہ گذر چکا ہے۔ بلکہ وہ اپنی طبیعی خصلت اور حالات زندگی کی وجہ سے ہر دخالت کرنے والے کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے تھے اور اسے کاری ضرب لگا سکتے تھے اسی لئے حملہ آور ہمیشہ خوف سے دوچار رہتا تھا اس علاقے سے استعماری قوتوں کو دور رکھنے میں اس امر کا بہت زیادہ کردار ہے علاوہ ازیں استعماری ارادے رکھنے والے جانتے تھے کہ اس عمل سے جو نقصان انہیں اٹھانا پڑے گا اس کے مقابلے میں انہیں زیادہ فوائد حاصل نہیں ہوں گے۔ خصوصاً عربوں کی حرمت پسندی جو ان کے خون اور دل و جان کی گہرائیوں میں رچی بسی ہوئی تھی اور وہ کسی قیمت پر بھی اس سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے، جس سے وہ لوگ اچھی طرح واقف تھے۔

مجموعی طور پر یہ عوامل اس علاقے میں واضح طور پر ایک سیاسی خلا کا سبب بنے بلکہ جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے سے کسی بھی بیرونی حکمران نے واسطہ نہ رکھا اور نہ اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اگرچہ اس کا جنوبی حصہ تھوڑے عرصے کے لئے حبشیوں کے زیر

۱۔ البدایہ و النہایۃ جلد ۲ صفحہ ۲۳۷ و ۲۳۸ اور حیات محمد (ہیکل) صفحہ ۸۹ پر رجوع کریں۔

تسلط رہا تھا۔ (۱)

اسی سیاسی خلاء نے اس سرزمین کو عیسائیت اور مجوسیت جیسے بڑے بڑے ادیان کے قابل ذکر اثر و نفوذ سے محفوظ رکھا اگرچہ حکام وقت کے اجبار کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہوتا تھا۔ اسی مسئلے نے انہیں یہودیت اور زرتشتی اثرات سے بھی دور رکھا جس کے پیروکار ان کے درمیان رہتے تھے۔ اسی طرح ان کی اسی خصوصیت نے انہیں غلط فہمیوں، شبہوں اور استعماری افکار خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی، سے دور رکھا۔ البتہ بعض اوقات بعض یہودی "مشرق اور مغربی روم" سے فرار ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوئے لیکن ان میں اپنی سرگرمیوں کا عنصر موجود نہ تھا۔ اگر کچھ تھا بھی تو اس کا فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں پر کوئی حکومت یا طاقت موجود نہ تھی جو ان کی تقویت سیاسی و تبلیغی لحاظ سے کرتی۔ اس لئے (جیساکہ پہلے گزر چکا ہے) کہا جاتا ہے کہ بعض عیسائی قبائل نے عیسائیت سے فقط شراب پینا سیکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت عقل و فطرت سے دور ہے وہ انسانی روح اور ضمیر سے رشتہ نہیں جوڑ سکتی جو اس کے کردار و رفتار پر مسلط ہوسکے۔

لیکن اسلام دین فطرت ہے اس نے بہت کم مدت میں ابوذر، سلمان اور عمار جیسے انسانوں کی تربیت کی ہے۔ سب سے پہلے یہ دین انسان کی عقل سے تعلق پیدا کرتا ہے پھر اس کے ضمیر اور روح سے متصل ہو جاتا ہے پھر اسے ایک خدائی انسان میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اسلام نے ان انسانوں کو جو کل تک وحشیانہ زندگی گزارتے تھے، کسی نظام کے پابند نہیں تھے اور کسی قانون اور ضابطے کی ان پر حکومت نہیں تھی ایسی امت میں بدل دیا جو سب سے زیادہ نظم و ضبط کی پابند اور قانون الٰہی کے ساتھ سب سے زیادہ وفادار اور مخلص تھی۔ اسی طرح نبی اکرمؐ اور آئمہ علیہم السلام نے جن محدود وسائل اور جتنے کم عرصے میں

۱۔ مختصر تاریخ العرب (سید امیر علی) ص ۸ پر رجوع کریں۔

جن افراد کی تربیت کی کوئی بھی حکومت ایسے افراد تیار نہ کرسکی۔ حتی وہ حکومتیں بھی جو اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتی تھیں، تمام وسائل کے باوجود ایسا نہ کرسکیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو معاشرے کی اصلاح و تربیت اور اس کے تزکیہ میں حقیقی رہبر کے اہم کردار کو واضح طور پر ثابت کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عربوں کی صاف طبیعتوں، خلاف فطرت افکار، انحرافات اور شبہات سے عدم آلودگی، علاوہ ازیں نظریاتی اور اعتقادی خلاء شرک کی غیر معقولیت اور بت پرستی، حق پر ایمان لانے کی صلاحیت کی موجودگی (جب ان پر حق واضح ہو جائے) اور ابتر معاشرتی حالات جن کا انہیں سامنا تھا۔ ان عوامل میں سے ہر ایک کا دعوت اسلام کے پھیلنے میں بڑا کردار تھا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے افراد صرف رسول اللہ کا کلام سن کر اسلام لے آئے یا فقط تلاوت قرآن سن کر دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے اور اگر ہم ان کے سرداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ عموماً اس کا انکار کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ دلیل و برہان قانع کنندہ نہیں تھا بلکہ اسلام سے ان کے دنیاوی مفادات کو نقصان پہنچتا تھا اور ان کے غیر انسانی ہوا و ہوس میں رکاوٹ ڈالتا تھا وہ اس فرمان الہی کے مصداق تھے۔ "و جحدوا بھا و استیقنتھا انفسھم"۔

اس بنا پر ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ لوگ ابتدائی طور پر دینی افکار اور تعلیمات پر دلیل و استدلال کا مطالبہ کرتے تھے کیونکہ طبیعت کی صفائی سالم فطرت اور شبہات و انحرافات سے دلوں کا اچاٹ ہونا دعوت حق کا ادراک کرنے اور صحیح و سالم افکار کے قبول کرنے کے لئے کافی تھا۔ قرآنی آیات نے بھی انہیں فطرت کی طرف رجوع کرنے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

لیکن بعد میں انسان کی فکر و عقل کے دائرے میں اجنبی افکار و نظریات اور مفاد پرستوں کے شبہات کے داخل ہونے سے اس کی فطرت پر پردے پڑ گئے اس کی فکر متزلزل و پراگندہ ہوگئی اور اس کی عقل کم ہوگئی اس کے بعد سے انسانوں کی اکثریت دلائل و براہین

کی زیادہ محتاج ہوگئی اور ہر ایک اپنی فطرت کی آلودگی اور غیروں کے افکار و شبہات سے متاثر ہونے کی وجہ سے اپنے آئمہ سے دلیل اور برہان کا مطالبہ کرتے تھے۔

۷۔ دشوار زندگی اور جانثاری

عربوں کی صحرائی اور کٹھن زندگی نے اس دعوت کے راستے میں، جس پر وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایمان راسخ لے آئے تھے اور وہ اس پر دل و جان سے عمل کرتے تھے، جان کی قربانی کو ان کے لئے نہایت آسان بنا دیا تھا کیونکہ وہ آسائش و آرام اور اعلیٰ و ارفع زندگی نہیں گزارتے تھے جو زندگی سے شدید محبت اور عشق کا موجب بنتا۔ یہ ایک واضح سی بات ہے کہ جہاں بھی سطح زندگی آرام دہ اور اعلیٰ و ارفع ہو انسان کا اس سے تعلق اور لگاؤ بیشتر ہوگا اور اس کے برعکس زندگی جتنی دشوار اور مشکل ہوگی اس سے گزر جانا اتنا ہی آسان ہوگا۔

ایسی دعوت جس کے قبول کرنے والوں کو مستقبل میں مختلف مصائب اور قسم قسم کی معنوی، اقتصادی اور معاشرتی مشکلات کا سامنا کرنا ہو لازمی طور پر اسے ایسے افراد کی شدید ضرورت ہوتی ہے جو مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے، دباؤ کو برداشت کرنے، بھوک و پیاس کو تحمل کرنے، آزار و اذیت، تشدد اور موت پر صبر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں عموی طور پر عرب ایسے ہی تھے کیونکہ اپنی دشوار اور سخت زندگی کے حوالے سے جتنی مصیبتیں ان کو دیکھنی چاہیے تھیں وہ دیکھ چکے تھے مسائل و مشکلات ان کی زندگی کی امتیازی خصوصیت تھی بلکہ یہ ان کی روزمرہ خوراک تھی اس کے علاوہ دیگر امور کو استثنائی صورت حاصل تھی۔

اس بنا پر جو کچھ اس دعوت کے حوالے سے متوقع تھا وہ اس کے برداشت کرنے کی طاقت رکھتے تھے کیونکہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والے ان مشکلات کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور ان مصائب کو تحمل نہیں کر سکتے تھے۔ عرب ایک صحرائی درخت کی مانند تھے

جس کی لکڑی بہت مضبوط اور جڑیں زیادہ گہری ہوتی ہیں۔

اس لئے ہم بعض مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کفار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر وہ کوئی رعایت کرنا چاہتے ہیں تو ابن عمیر کے ساتھ رعایت کریں کیونکہ وہ اسلام سے پہلے ناز و نعم میں پلا بڑھا تھا لیکن جب اس نے اسلام قبول کیا تو اس پر مشکلات اور مصائب آن پڑے لہذا ان کو برداشت کرنے پر باقی مسلمان اس سے ہمدردی اور شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ اس کی وجہ وہی نکتہ تھا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

۸۔ عربوں میں دین حنیف کے باقیماندہ اثرات

گذشتہ امور کے علاوہ اسلام کے پھیلاؤ میں جو عناصر مددگار ثابت ہوئے ان میں سے ایک جزیرۃ العرب میں دین حنیف کے اثرات کا موجود ہونا تھا (یعنی دین ابراہیمی، مثال کے طور پر حج اور اسکے آداب) خصوصاً مکے میں کیونکہ عرب حضرت اسماعیلؑ کی اولاد تھے اور دین حق انہوں نے ان سے میراث میں پایا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ حق و باطل کو مخلوط کرتے گئے جیساکہ دوسری امتوں میں بھی ہوتا ہے جب جہالت کے پردے انکے سامنے آجائیں نیز انحرافات اور نفسانی خواہشات ان پر غالب آئیں، یہاں تک کہ وہ شرک و بت پرستی (جیساکہ پہلے ذکر کیا گیا ہے) باطل امور، برے اخلاق اور ناپسندیدہ اعمال میں مبتلا ہوگئے آخرکار وہ اس اندھی جاہلیت میں گھر گئے جس کا امیرالمومنینؑ نے ذکر کیا ہے۔

البتہ ان کے علاوہ ایک تعداد ایسی تھی (اگرچہ وہ بہت کم تھی) جو اسی توحیدی عقائد پر باقی تھی، بت پرستی کی مذمت کرتی تھی اور ہمیشہ مناسب انداز سے خدا کی پرستش کرتی تھی ان کا دین، دین ابراہیم کی تعلیمات کے قریب تھا عبدالمطلب اور بنی ہاشم کے پاکیزہ افراد اسی قبیل کے تھے۔

دین حنیف کی باقی ماندہ تعلیمات میں تعظیم کعبہ، طواف، عرفات میں وقوف، اونٹ کی

قربانی اور تلبیہ (۱) وغیرہ شامل تھیں اگرچہ انہیں مسخ شدہ اور باطل سے آمیختہ صورت میں انجام دیا جاتا تھا، جو امر دین کا جزء نہیں تھا اسے دین کے عنوان سے بجا لایا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج ان میں کمی آگئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کا صرف نام ہی باقی رہ گیا۔

خلاصہ یہ کہ ظہور اسلام کے وقت عربوں کے ذہنوں اور ضمیروں میں کچھ دھندلی سی یادیں تھیں جو انہیں دین حنیف سے مربط رکھتی تھی وہی دین جس پر ان کے آباء و اجداد تھے (عرب چونکہ جنگ و غارتگری کے موقعوں پر اپنے نسب پر فخر کرتے تھے) جب نبی اکرمؐ اسی دین حنیف کو کامل کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تو طبیعی امر ہے کہ ان یادوں اور تصورات کا آپؐ اور آپ کے مثبت اور حقیقت پسندانہ پیغام کے بارے میں لوگوں پر ایک مثبت اثر پڑا۔

۹۔ عربوں کی خصوصیات اور عادات

عربوں کی بعض عادات، خصوصیات اور اخلاقیات رسول اکرمؐ کی دعوت اسلام (جو حق اور خیر و برکت کی دعوت تھی) کی ترویج و اشاعت میں بہت زیادہ موثر ثابت ہوئیں اگرچہ اپنی خصوصیات اور عادات جن سے اسلام نے فائدہ اٹھایا، کو زیادہ معقول اور مقبول بنانے کے لئے اور انہیں صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اسلام نے اقدامات کئے، لیکن ان میں سے جو اوصاف اسلام کی نظر میں نا قابل قبول تھے ان سے اگرچہ گاہے اسلام کو فائدہ پہنچا تھا پھر بھی ان کو ختم کرنے کے لئے اسلام نے حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے ہر موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ مثال کے طور پر اسلام نے دفاع اسلام کے حوالے سے عربوں کی

۱۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں ج۱ ص ۲۵۷-۲۵۴ میں مکّے ہر قبیلے کی تلبیہ اور بعض دوسری رسومات کا ذکر کیا ہے خواہشمند حضرات اس کتاب کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔

شجاعت اور سخت کوشی سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اسی طرح قبائلی تعصب سے استفادہ کر کے بہت اچھے نتائج حاصل کئے۔ بعد از ہجرت مدینے میں دو قبیلے اوس و خزرج دو پہلوانوں کی طرح رسول اللہ کی ہمراہی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اوس رسول اللہ کی خوشنودی اور رضایت کے لئے کوئی کام انجام دیتے تو خزرج خدا کی قسم کھا کر کہتے کہ وہ اس ذریعے سے رسول اللہ کے نزدیک نہ ہو جائیں اور اس فضیلت کی وجہ سے ہم سے برتری حاصل نہ کر لیں لہذا وہ اپنے کام کو مکمل نہ کر پاتے کہ یہ بھی انہی کی طرح کام کو انجام دیتے اور اگر خزرج کوئی عمل بجا لاتے تو اوس یوں کہتے تھے۔ (۱)

ہجرت سے قبل مکے میں مسلمانوں کے درمیان قریش اور دوسروں سے مشکلات کو سہنے میں سبقت لے جانے میں قبائلی تعصب کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ آنحضرتؐ اور دوسرے مسلمانوں کی زندگیوں کو دشمنوں کی طرف سے درپیش خطرات کو روکنے میں اس کا بڑا موثر کردار تھا اگر ان کا قبیلہ نہ ہوتا جس کا انہیں ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور ان کا کام تمام کر دیتے اگرچہ بعض اوقات انہیں طاقت فرسا اذیتوں اور شدید مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا یہاں تک اللہ تعالی نے انہیں مدینے کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی۔

اس لئے ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ نے بہت مواقع پر قبائلی تعصب (حمیت) سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ بنی ہاشم کو خواہ وہ مسلمان تھے یا کافر، کو شعب ابیطالب میں معاشی بائیکاٹ کی مصیبتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

حضرت ابوطالب کے شعروں میں بنی ہاشم اور قریش کے بعض قبیلوں کے درمیان قرابت کے عنصر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ امر حضرت رسول اکرمؐ کو دشمنوں کی

۱۔ تاریخ طبری طبع الاستقامۃ ج ۲ ص ۱۸۴ اور الکامل (ابن اثیر) طبع صادر ج ۲ ص ۱۴۶ پر رجوع کریں۔

سازشوں سے محفوظ رکھنے میں نہایت موثر تھا۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔

بلکہ خود مشرکین نے آپؐ سے بغض و عناد میں یا آپؐ کے قتل کی سازش کے وقت (جو آپؐ کی ہجرت کا موجب بنی) اپنے قبائلی تعلقات کو ہی مدنظر رکھا۔ ان کے بارے میں ہم آئندہ بات کریں گے، انشاء اللہ تعالی۔

مدینے میں بھی عربوں کی مہمان نوازی، عہد و پیمان کے ساتھ وفاداری، امان کی پابندی، آزاد منشی، غیرت، عزت نفس، خود اعتمادی، قوت ارادی اور شجاعت و بسالت کے بہت سارے اثرات مرتب ہوئے۔ حتی کہ جنگ و جدل کی وجہ سے ان میں پیدا شدہ سخت مزاجی نے انہیں دین و اعتقاد کے راستے میں عواطف و جذبات سے بے نیاز کر دیا یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹوں، بھائیوں اور باپوں کو بھی قتل کر دیتے تھے۔

۱۰۔ ابوطالبؑ اور علیؑ کی شجاعت اور خدیجہؑ کی دولت کا کردار

ہمیں شیخ الابطح ابوطالبؑ جیسے بڑے انسان کی مکے میں دشمنوں کے مقابلے میں آنحضرتؐ کی مکمل حمایت پر ضرور روشنی ڈالنی چاہیے۔

اسی طرح اس اہم اقتصادی عامل کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے جو نبی اکرمؐ کی زوجہ حضرت خدیجہ (س) نے اسلام کے لئے فراہم کیا۔ وہی دولت و ثروت جس کی وجہ سے (بعض کے نظریے کے مطابق) جزیرۃ العرب کے اقتصاد کی چابی ان کے ہاتھ میں تھی۔

نبی اکرمؐ نے وہ تمام دولت مسلمانوں پر گزرنے والے سخت ترین حالات اور قریش کی طرف سے اقتصادی بائیکاٹ اور آزار و اذیت کے دوران خرچ کر ڈالی۔

آنحضرتؐ کی طرف سے مسلمانوں پر اموال کو خرچ کرنے کی ایک دلیل اسماء بنت عمیس کا یہ قول کہ جب حضرت عمر نے اسماء کو یہ طعنہ دیا کہ وہ ہجرت کے مقابلے میں اس (اسماء) پر سبقت رکھتا ہے اور یہ کہ وہ ایک حبشی اور دیہاتی عورت ہے۔ (اس بارے میں صحیح مسلم اور دوسروں نے جو کچھ لکھا ہے اسکی بنا پر) اسماء نے اسے کہا: "تم نبیؐ کے

ساتھ تھے انھوں نے تمہارے بھوکوں کو کھانا کھلایا اور تمہارے جاہلوں کو موعظہ کیا"۔ (۱)

اور آخر میں انہی مباحث کے دوران نبی اکرمؐ کے وصی اور بھائی امیرالمومنین علیؑ کے کردار کا تذکرہ بھی ضروری ہے اگرچہ اختصاراً ہی سہی۔

ہاں! ان میں سے ایک عنصر کا اسلام کی ترویج و اشاعت، اس کی حفاظت اور کامیابی میں بہت بڑا عمل دخل ہے۔ جو کسی بھی با بصیرت اور آگاہ محقق سے پوشیدہ نہیں ہے۔

البتہ اسلام کی ترویج و اشاعت اور وسعت و مقبولیت میں اور بھی عوامل کار فرما تھے جن میں سے بعض کی طرف اسلامی تاریخ کے دریچوں سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

اس مقام پر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ سید المرسلین نبی اکرمؐ کی بعثت کے بعد کی زندگی پر کچھ روشنی ڈال سکیں البتہ جس حد تک ہمارے بس میں ہے۔

قابل توجہ نکتہ

ہماری تمام گزشتہ گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جزیرۃ العرب میں اسلام کی اشاعت و ترویج، ایک طبیعی امر کا نتیجہ تھی۔ اس لحاظ سے کہ اگر یہ تمام اسباب و عوامل کسی اور تحریک کو بھی میسر آجاتے تو وہ بھی یہی نتائج حاصل کرتی جو اسلام نے حاصل کئے تھے۔

بلکہ معاملہ برعکس ہے اس علاقے میں اسلام کی کامیابی اور ظہور خود ایک معجزہ ہے اور اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے وگرنہ اس علاقے میں یہودی بھی موجود تھے اور یہ تمام عناصر اور عوامل انہیں بھی میسر تھے لیکن وہ عربوں کے افکار اور کردار و گفتار پر کوئی اثرات مرتب نہ کر سکے۔ (۱)

۱۔ قاموس الرجال ج ۱۰ ص ۳۸۰ اور بعض دوسرے مآخذ جنکا جلد ذکر کرینگے۔

۲۔ اگرچہ دین یہود ایک خاص نسل میں منحصر ہے اور دوسری قوموں میں سرایت نہیں کرتا۔

اسی طرح عیسائیوں نے بھی اپنے دین کی ترویج اور ہر شخص کو عیسائی بنانے کے لئے اپنی توان و قدرت کے مطابق ہاتھ پاؤں مارے، مجوسیوں اور دیگر ادیان نے بھی کوششیں کیں لیکن سب ناکام رہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام، اس کے مشن اور اس کے قائد و رہبر کا اسلام کی انقلاب آفرین تحریک، اس کی کامیابی اور بقاء میں ذاتی طور پر اہم بلکہ کلیدی کردار تھا۔ ورنہ ہر قسم کی کامیابی (اگر حاصل ہو) نہایت محدود ہوتی ہے خاص مدت تک باقی رہتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی قدرت و طاقت میں وقت گزرنے کے ساتھ اور مختلف حالات و شرائط میں روز افزوں ترقی اور تکامل پیدا ہوتا گیا۔ وقت کے بدلنے اور بعض عوامل کے فقدان سے اس پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا ظاہری طور پر اور اسلام کے رشد و نمو اور ترقی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان باتوں کے باعث اس میں واضح ترقی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ جو بات اس حقیقی پیشرفت کو ہمارے لئے بیان کرتی ہے وہ وہی ہے جس کا ہم ذکر کر چکے تھے۔ یہ کہ اسلام انسان کی تمام باطنی قوتوں پر چھا جانے اور ان کو حق اور دین کی راہ میں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ مختلف حالات اور شرائط کے ساتھ ہماہنگ ہو سکتا ہے۔ دوسری محدود اور جامد دعوتوں کے برخلاف اسلام کے پاس ہر مرض کی دوا، ہر مشکل کا حل اور ہر قسم کے حالات سے نپٹنے کا سلیقہ ہے۔

لہذا جب اسلام جزیرۃ العرب میں کامیابی سے ہمکنار ہوا تو اس دور میں اس علاقے میں ایسے بہت سے عوامل جو دعوت کے اہم امور میں انتہائی مددگار ثابت ہو سکتے تھے، موجود نہیں تھے۔ اگر اسلام کے علاوہ کوئی اور مشن ہوتا تو وہ ہرگز کامیاب نہ ہوتا لیکن ان عوامل کے فقدان کا اسلام پر کوئی اثر نہ تھا جس طرح دشمنوں کے ہاں ان تمام وسائل و اسباب کی موجودگی سے بھی اس کے اوپر کوئی اثر نہ پڑا۔

البتہ اسلام نے اپنی کامیابی کے لئے بعض وسائل اور حالات سے استفادہ کیا تھا اور حالات کو اپنے حق میں بدل کر ترقی کی جانب بڑھایا تھا اور یہ اسلام کی عظمت اور سربلندی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام پر عمل کرنے اور اس کی ہدایت کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے، انہ ولی قدیر۔

فہرست

مقدمہ ناشر ۵
ضروری وضاحتیں ۷

پیش لفظ
ماضی کا حال سے رشتہ اور نگارش تاریخ ۱۳
کیا ہماری بھی کوئی تاریخ ہے؟ ۱۴
تاریخ کا تجزیہ ۱۵
ہمارا طریقہ کار ۱۶
اہم حقیقت ۱۶

تمہید
صفات النبیؐ ۱۹
دین اور امت سے غداری ۲۰
خطرناک سازش ۲۲
راز پنہاں ۳۴
اموی سیاست کے نتائج ۳۷
روایات کو جانچنے کے اصول ۴۵
نتیجہ ۵۲
طبیعی آغاز ۵۲

پہلا باب
بعثت سے پہلے کے حالات

پہلی فصل۔ آنحضرتؐ کی ولادت سے پہلے

جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی حالات	۵۷
جزیرہ نمائے عرب کے شہری	۵۹
عربوں کے اجتماعی حالات	۵۹
عورت دور جاہلیت میں	۶۱
جاہلیت میں عربوں کے حالات کے چند نمونے	۶۳
عربوں کے علوم	۶۴
عربوں کی خصوصیات	۶۶
عربوں کے امتیازات	۶۷
اسلام اور مذکورہ صفات	۷۰
بنائے مکہ کی تاریخ	۷۳
الف۔ تاسیس کعبہ	۷۳
ب۔ ابراہیمؑ کی دعا	۷۵
ج۔ کعبہ کا احترام	۷۶
کعبہ اور بت	۷۹
تولیت کعبہ	۸۱
قریش کا مرتبہ	۸۳
میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں	۸۵
چند قابل غور نکات	۸۹
بداء۔ شیعہ نقطہ نظر سے	۹۴
توضیح اور تمثیل	۹۶

ایک سوال اور اس کا جواب ۹۷
یہود اور بداء ۹۹

دوسری فصل، آنحضرتؐ کی ولادت سے بعثت تک

رسول اکرمؐ کا نسب گرامی ۱۰۳
نبی اکرمؐ کی ولادت ۱۰۴
ایک اہم یاددہانی ۱۰۵
نبی اکرمؐ کی جائے ولادت کا حال ۱۰۷
رسول اکرمؐ کی رضاعت ۱۰۷
حدیث شق الصدر ۱۱۰
روایت کا جائزہ ۱۱۱
اس روایت کے متعلق ہمارا نظریہ ۱۱۳
عیسائی اور حدیث شق الصدر ۱۱۶
روایت کی بنیاد جاہلیت ۱۱۸
نبی اکرمؐ کی کفالت ۱۱۹
بحیرا اور شام کا پہلا سفر ۱۲۲
جھوٹی روایت ۱۲۲
حدیث گھڑنے کی وجہ ۱۲۴
بحیرا کے واقعہ میں چند اشارے ۱۲۵
حضور اکرمؐ کی جنگ فجار میں شرکت ۱۲۷
جعلی روایات کا کھیل ۱۲۹
حلف الفضول ۱۳۰
حلف کا سبب ۱۳۱
بنوامیہ اور حلف الفضول ۱۳۲

قابل توجہ نکتہ	۱۳۵
حلف الفضول کے بارے میں چند اہم نکات	۱۳۶
حضور اکرمؐ کا بکریاں چرانا	۱۴۴
نکتہ	۱۴۶
شام کا دوسرا سفر	۱۴۸
رسول اکرمؐ کی حضرت خدیجہ (س) سے شادی	۱۵۱
حضرت ابوطالبؑ اور خواستگاری	۱۵۳
حضرت ابوطالبؑ کے کلمات پر ایک نظر	۱۵۸
قریش کا یتیم۔ واضح جھوٹ	۱۵۹
کیا آپؐ نے دولت کے لالچ میں شادی کی؟	۱۶۱
خدیجہ (س)۔ ایک اعلیٰ نمونہ	۱۶۲
قریشی عورتوں میں خدیجہ (س) کا مقام	۱۶۲
کیا حضرت خدیجہ (س) کنواری تھیں؟	۱۶۳
کیا عثمان کی دو بیویاں پیغمبرؐ کی بیٹیاں تھیں؟	۱۶۷
کیا زینب رسول اللہؐ کی بیٹی تھی یا ربیبہ	۱۶۹
علیؑ کے رقیب	۱۷۰
رسول اللہؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہ (س) کی عمر مبارک	۱۷۱
امیرالمومنینؑ کی تاریخ ولادت	۱۷۱
دو ہاشمیوں سے متولد ہونے والا پہلا ہاشمی	۱۷۴
امیرالمومنینؑ کی کعبہ میں ولادت	۱۷۵
حکیم بن حزام کیوں؟!	۱۷۸
خانہ کعبہ کی تعمیر	۱۷۹
حجرالاسود کی تنصیب	۱۸۲
اہم نکات	۱۸۳
ایک جسارت	۱۸۵

ہائے میرے کپڑے! ۱۹۱
حضرت عثمان کی حیا ۱۹۳
اہل کتاب اور انبیاء کی برہنگی ۱۹۶
ولادت حضرت فاطمہ (س) بنت رسول اللہؐ ۱۹۷
صحیح نظریہ ۱۹۸

تیسری فصل، تذکرہ سیرت سے پہلے کچھ باتیں

پہلی بات، نبی اکرمؐ کے آباء و اجداد (حضرت آدمؑ تک) کا ایمان ۲۰۵
اس موضوع پر بعض دلیلیں ۲۰۶
حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ کیلئے طلب مغفرت کرنا ۲۰۹
میرا اور تمہارا باپ جہنم میں ہیں ۲۱۱
قابل توجہ نکتہ ۲۱۲
عجیب نکتہ ۲۱۵
دوسری بات، بعثت سے پہلے پیغمبرؐ کا دین ۲۱۷
بعض افسانے ۲۲۰
بتوں کو چومنا یا تبرکاً چھونا ۲۲۲
تیسری بات، ایک تحریک کی شرائط ۲۲۵
چوتھی بات، اسلام کی ترویج و اشاعت کے عوامل ۲۳۱
۱۔ مقام دعوت ــ مکہ ۲۳۱
۲۔ رسول اللہؐ کی ذاتی خصوصیات ۲۳۳
۳۔ اجتماعی حالت ۲۳۷
۴۔ حضورؐ کے معجزے کی نوعیت ۲۳۸
۵۔ آنحضرتؐ کی نبوت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی بشارتیں ۲۴۰
اہل کتاب کے رہائشی علاقے ۲۴۳

اہل کتاب اور عربوں پر ان کا عملی دبدبہ ۲۴۴
۶۔ سیاسی اور نظریاتی خلاء ۲۴۷
۷۔ دشوار زندگی اور جاں نثاری ۲۵۱
۸۔ عربوں میں دین حنیف کے باقیماندہ اثرات ۲۵۲
۹۔ عربوں کی خصوصیات اور عادات ۲۵۴
۱۰۔ ابوطالبؑ اور علیؑ کی شجاعت اور خدیجہ (س) کی دولت کا کردار ۲۵۵
قابل توجہ نکتہ ۲۵۶

دوسرا باب
بعثت سے اعلانِ نبوت تک

پہلی فصل، بعثت

بعثت کے وقت رسول اللہؐ کی عمر مبارک ۲۶۳
بعثت کا مہینہ رجب یا رمضان اور نزول قرآن کی کیفیت ۲۶۴
ہماری رائے ۲۶۷
نتیجہ ۲۶۸
آغاز وحی ۲۷۱
قرآن کا اعجاز ۲۷۲
دلیل ۲۷۵
بلاغت قرآن ۲۷۷
بلاغت ۲۷۷
اعجاز اور بلاغت کا ارتباط ۲۷۸
توضیح اور تطبیق ۲۷۸
ترجمہ اور تفسیر قرآن ۲۸۴

قرآن کا ظاہر و باطن ۲۸۵
محکم و متشابہ ۲۸۷
تاویل ۲۹۱
حروف مقطعات ۲۹۳
آغاز وحی کی روایات ۲۹۶
آغاز وحی کی روایات پر اعتراضات ۳۰۳
دیگر اعتراضات ۳۱۸
نبوت پر ایک اور ضرب ۳۱۹
آغاز وحی کی حقیقی صورتحال ۳۲۲
جھوٹ اور بناوٹی باتیں کیوں ۳۲۳
نتیجہ ۳۲۹

دوسری فصل۔ خفیہ دعوتِ اسلام

پہلا مسلمان ۳۳۳
علیؑ کی اسلام میں سبقت ۳۳۵
امیرالمومنینؑ کے صریح بیانات ۳۳۷
ایک دلیل اور ۳۳۸
حرف آخر ۳۳۹
خدیجہؑ (س) کو اولین مسلمان قرار دینا ۳۴۰
ابوبکر کی اسلام میں سبقت ۳۴۱
توافق کی ناکام کوشش ۳۴۷
ان کا ہدف ۳۴۹
موازنہ اور ہدف ۳۵۰
ابوبکر کی دعوت پر مسلمان ہونے والے ۳۵۱
ابوبکر کے رول (کردار) پر زور کیوں؟ ۳۵۷

کیا عمیر بن ابی وقاص اولین مسلمانوں میں سے تھے؟ ۳۵۸
ابو قحافہ کا قبول اسلام ۳۵۸
دعوت کے مراحل ۳۵۹
خفیہ مرحلہ ۳۶۰
نبی اکرمؐ اور دارالارقم ۳۶۱
قریش اور رسول اللہؐ دعوت کے خفیہ مرحلہ کے دوران ۳۶۳
حضرت ابوذرؓ کا قبول اسلام ۳۶۳
ابوذرؓ کے قبولِ اسلام کے واقعے سے حاصل ہونے والے نتائج ۳۶۶

تیسری فصل، اسراء اور معراج

اسراء اور معراج ۳۷۳
اسراء اور معراج کی تاریخ ۳۷۳
قابل توجہ نکتہ ۳۸۰
اسراء اور معراج ــ خواب میں یا بیداری میں ۳۸۱
اسراء اور معراج ــ قرآن کی روشنی میں ۳۸۴
ایک سوال اور اس کا جواب ۳۸۵
لاتدرکہ الابصار ۳۸۷
سیر کی ابتداء مسجد سے ۳۹۳
حضرت موسیٰؑ اور پنجگانہ نمازیں ۳۹۳
اسراء اور معراج میں تعجب ۳۹۶
اسراء اور معراج کے مقاصد ۳۹۷
اذان ۴۰۰
قرآن میں یہودیوں اور مسجد کا تذکرہ ۴۰۰
آیات کا اجمالی مفہوم ۴۰۱
راویوں اور مفسروں کے اقوال ۴۰۵

علامہ طباطبائی کی رائے	۳۰۶
آیات کے بارے میں ایک اور قول	۳۰۸
ایک اور نظریہ	۳۰۹
نظریہ دیگر	۳۰۹
ایک اور نظریہ	۳۱۲
دیگر روایات	۳۱۳
سب سے بہتر نظریہ	۳۱۴
وہ اہل قم ہی ہیں	۳۱۵
طولانی جنگیں	۳۱۵
دیگر روایات	۳۱۶
مغرب اور اسرائیل	۳۱۸
فلسطین اور انکی سرزمین	۳۱۹
فہرست	۳۲۲